قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جولائی 1975

اس پرچہ میں

(علامہ) اقبال — اور — (مولانا) حسین احمد مدنی

(معرکۂ دین و وطن)

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ-۲ لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

قرآن مجید سمجھ میں نہیں آسکتا

- ترجموں سے کیونکہ قرآنی الفاظ کے مرادفات دنیا کی کسی زبان میں نہیں مل سکتے
- تفسیروں سے کیونکہ تفاسیر میں عام طور پر مفسروں کے اپنے خیالات اور معتقدات قرآنی مطالب پر غالب آجاتے ہیں۔
- قرآن مجید اس طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ عربی مبین کی مستند کتب لغت کی رو سے اس کے الفاظ کے معانی متعین کئے جائیں اور ایک مضمون کی مختلف آیات کو سامنے رکھ کر اس کا مفہوم مرتب کیا جائے

مفکر قرآن پرویز صاحب نے چالیس سال کی محنت شاقہ سے پہلے اس قسم کا ایک لغات مرتب کیا اور اس کے بعد پورے قرآن کا مفہوم اسی انداز سے متعین کیا —— جو

مفہوم القرآن

کے نام سے شائع ہوگیا ہے۔ قرآن فہمی کے سلسلہ میں اس کی مثال کہیں نہیں ملے گی۔

- مفہوم القرآن (مع متن) موتیوں کی طرح ترشے ہوئے نستعلیق میں بلاکس کے ذریعے عمدہ سفید دبیز کاغذ پر چھاپا گیا ہے اور تین نہایت مضبوط خوبصورت سنہری جلدوں پر مشتمل ہے۔ ضخامت پندرہ سو صفحات۔
- قیمت: جلد اول پینتیس روپے جلد دوم پینتیس روپے جلد سوم چالیس روپے مکمل ایک سو دس روپے

ادارہ طلوع اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

ملنے کا پتہ:

مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ٹیلی فون
۸۰۸۰۰

خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ
۱½
ڈیڑھ روپیہ

بدل اشتراک
پاکستان
سالانہ ——— پندرہ روپے
غیر ممالک
سالانہ ——— ڈیڑھ پونڈ

جلد (۲۸) | جولائی ۱۹۷۵ء | نمبر (۷)

فہرست

(۱) لمعات ——— ۲
(۲) اقبالؒ اور قرآن ——— ۷
(۳) اب "بہائی" آگے بڑھے ——— (محترم پرویز صاحب) ——— ۹
(۴) عربی کے بغیر اسلامیات کی تدریس ——— (پروفیسر رفیع اللہ شہاب) ——— ۷
(۵) علامہ اقبالؒ اور مولانا حسین احمد مدنی ——— ۲۵ - ۴۳

ایڈیٹر محمد خلیل - ناشر سراج الحق - مقام اشاعت ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور - پرنٹر شیخ نیاز احمد - مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ۱۷ ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

ایک عام کہاوت ہے کہ "ہر انسانی بچے کی پیدائش اس امر کی شہادت ہوتی ہے کہ فطرت الٰہی انسان کی طرف سے مایوس نہیں ہوئی"۔ فطرت کا تو معلوم نہیں کہ وہ انسانوں کی طرف سے مایوس ہو چکی ہے یا نہیں، لیکن کبھی کبھی ایسے واقعات ظہور میں آجاتے ہیں جو اس امر کی شہادت بنتے ہیں کہ دنیا ابھی انسانوں سے خالی نہیں ہوئی — ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں — یہی وہ لوگ ہیں جو مایوس انسانوں کے لیے زندگی کا سہارا اور قوموں کی ڈوبنے والی کشتی کے لیے روشنی کا مینار، یا اقبالؔ کے الفاظ میں — بیاباں کی شب تاریک میں قندیلِ رہبانی — قرار پاتے ہیں۔ اسی قسم کا ایک واقعہ بھارت کی سرزمین پر ۱۲ جون کی صبح کو رونما ہوا۔ جب وہاں کی (الٰہ آباد کی) ایکورٹ کے ایک جج۔ جسٹس جگ موہن لال نے مسز اندرا گاندھی کے خلاف انتخابی عذرداری کے مقدمہ کا فیصلہ سنا دیا۔ اس نے مسز گاندھی کو مجرم، اس کے انتخاب کو کالعدم اور اسے چھ سال کے لیے کسی انتخاب میں حصہ لینے کا نااہل قرار دے دیا۔

آپ کہیں گے کہ یہ کونسا ایسا نادر الوقوع اور "فوق الفطرت" واقعہ ہے جس کا ذکر ہم نے ایسے تحیر انگیز انداز سے کرنا اور طلوعِ اسلام کے لمعات کا موضوع قرار دینا ضروری سمجھا ہے۔ مختلف عدالتوں میں اس قسم کے مقدمات کے فیصلے ہوتے ہی رہتے ہیں — کوئی مستغیث کے حق میں، کوئی اس کے خلاف — یہ درست ہے کہ بظاہر یہ کوئی ایسا واقعہ نہیں جس کا تذکرہ اس انداز سے کیا جاتا، لیکن اگر سطح سے ذرا نیچے اتر کر دیکھیں تو ہمیں امید ہے کہ آپ ہم سے متفق ہوں گے کہ یہ فی الحقیقت اس اہمیت کا مستحق تھا۔

مسز اندرا گاندھی صرف بھارت کی وزیر اعظم نہیں۔ وہ اُس "اکال الامم" کی ایسی "کالی ماتا" ہے جو وہاں کے ایسے ایسے چوٹی کے لیڈروں کو زندہ نگل گئی ہے جو اسی عمر کے لحاظ سے اس کے باپ ہی کے نہیں، دادا تک کے ہم عصر تھے اور بین الاقوامی شہرت کے مالک۔ اس نے وہاں کے دیوقامت راہ نماؤں سے ٹکر لی اور ان کے بتوں ہی کو نہیں، مندروں تک کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ اس طرح اس نے ایک ایسے مطلق العنان ڈکٹیٹر کی حیثیت حاصل کر لی جس کے سامنے کسی کو دم مارنے کی جانہ رہی۔ ابھی کل کی بات ہے کہ وہ اپنی ہمسایہ سلطنت سکم کو اس کے فرمانروا — چوگیال — سمیت اس طرح نگل گئی جس طرح ریت پر لیٹا ہوا مگرمچھ کسی ننھے سے بچے

کو ہڑپ کر جائے۔ ہندوستان میں اس کے دبدبہ اور طنطنہ کا یہ عالم ہے کہ اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک فقرہ، اس ایٹمی دھماکہ سے کہیں زیادہ ہیبت انگیز اور لرزہ خیز ہوتا ہے جسے اس نے چند ماہ اُدھر اپنے ہمسایہ ممالک کو خوفزدہ کرنے کے لیے ہماری سرحدوں کے قریب کیا تھا۔ پھر اس نے مختلف حربوں سے اپنے سنگھاسن (تختِ حکومت) کے پایوں کو اس قدر مستحکم کر رکھا ہے کہ کسی کے تصور میں بھی نہیں آسکتا کہ وہ کبھی اپنی جگہ سے ہل سکتے ہیں۔

وہ شخص بڑا نڈر اور باہمت تھا جس نے اس قسم کے آمرِ مطلق اور استبدادِ مجسم کے خلاف عدد داری کا مقدمہ دائر کیا۔ یہ مقدمہ چار سال سے زیرِ سماعت تھا اور دنیا کی نگاہیں اس کے فیصلہ کی طرف لگ رہی تھیں۔ اس کے فیصلہ میں جوں جوں تاخیر ہو رہی تھی، لوگوں کے یہ شبہات قوی سے قوی تر ہوتے جا رہے تھے کہ نہ معلوم اس جج پر کس قدر دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ ان حالات میں شخصیتوں کو بالائے طاق رکھ کر عدل و انصاف کے تقاضوں کے مطابق، اس قسم کے ڈکٹیٹر کے خلاف ایسا فیصلہ دے دینا جس قدر جرأت اور ہمت چاہتا ہے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس سے مسٹر جسٹس جگ موہن لال نے اپنی بلندیٔ کردار ہی کا ثبوت نہیں دیا بلکہ اس عدالت کے وقار کو بھی ٹھیس لگنے سے بچا لیا جس کے ساتھ متمسک ہونے کا اُسے فخر حاصل ہے — اتنا ہی نہیں بلکہ اس سے اس نے اپنے ملک اور قوم پر بھی بہت بڑا احسان کیا ہے۔ دنیا کے ہر اس ملک میں جس میں جمہوریت کے پردے میں آمریت کا دَور دورہ ہے۔ جس طرح لاقانونیت معاشرہ کا عام شعار بن جاتی اور عدل و انصاف کی مٹی پلید ہوتی ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تاریخ کا ایک ایک ورق اور عصرِ حاضر کا ایک ایک سانحہ اس کی زندہ شہادت ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان ممالک میں قانون کا احترام اُٹھ چکا ہے اور عدالتیں اضحوکہ بن کر رہ گئی ہیں۔ بین الاقوامی برادری میں ایسی قوموں کا نہ کوئی وقار باقی رہتا ہے نہ عزت۔ اسے سب ذلت کی نگاہوں سے دیکھتے اور یہ ہزار بدگمانی ان کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں۔ ایسے ملک میں کوئی ایسا فیصلہ جو قانون کی عظمت کو برقرار اور عدالت کے وقار کو قائم رکھنے کا موجب ہو، اس قوم کی گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالا دینے کا موجب بن جاتا ہے۔ جمہوری آمریت کے تصدق، بھارت اس مقام پر پہنچ چکا تھا جسٹس جگ موہن لال کے اس فیصلہ نے اس قوم کے کھوئے ہوئے وقار کو پھر سے قائم کر دیا ہے اور اسے دنیا کی برادری میں سینہ تان کر کھڑے ہونے کے قابل بنا دیا ہے کہ ہمارے ہاں عدلیہ کا معیار اتنا بلند ہے کہ بڑی سے بڑی شخصیت بھی اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ یہ بہت بڑا احسان ہے جو اس نے اپنی قوم پر کیا ہے۔ ڈکٹیٹر کی کٹھ پتلیوں نے اس کا پتلا جلایا ہے لیکن اس آگ سے اُس کا کردار اور بھی کندن بن کر نکھرے گا۔ اگر مسز اندرا گاندھی بلندیٔ کردار کا ثبوت دیتی اور بغیر کسی دباؤ کے اس فیصلہ پر اپنے منصب سے مستعفی ہو جاتی تو نہ صرف یہ کہ وہ اپنے ملک کی تاریخ میں اَمر (زندۂ جاوید) ہو جاتی بلکہ اس کی قوم کا وقار اور بھی بڑھ جاتا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ڈکٹیٹر میں کیریکٹر نہیں ہوتا۔ اسی لیے تو وہ ہر کام دھاندلی سے کرتا اور کراتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ہم نے اس واقعہ کو اس قدر اہمیت کا مستحق کیوں قرار دیا ہے۔

ہمارے صدرِ اول میں چونکہ اس قسم کے واقعات معاشرہ کا عام معمول تھے، اس لیے ہماری تاریخ نے انہیں چوکھٹوں کے اندر سنہ سرخیوں کے ساتھ" لکھنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ وہ روزمرہ کے واقعات کی طرح ان کا تذکرہ کر کے

آگے بڑھ جاتی ہے اور اسے کرنا بھی ایسا ہی چاہیئے۔ ایسی قوم میں (مثلاً) جس میں سچ بولنا معاشرہ کا ایک عام دستور اور معمول ہو، کیا اس قسم کی خبر بھی نمایاں طور پر قابلِ ذکر قرار پا سکتی ہے کہ فلاں شخص نے نتائج کی پرواہ کیئے بغیر سچ بولا۔ جھوٹ سے کام نہیں لیا؟ اسی طرح جس معاشرہ میں ہر متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ قانونِ خداوندی کی رو سے ہوتا ہو، بالا لحاظ اس کے کہ مدعی کون ہے اور مدعا علیہ کون۔ مستغیث کی حیثیت کیا ہے اور ملزم کی، اس قسم کے واقعات کو کون نادرۂ روزگار قرار دیتا ہوگا کہ فلاں یہودی نے خلیفۃ المسلمین کے خلاف دعویٰ دائر کیا اور قاضی نے فیصلہ خلیفۃ المسلمین کے خلاف اور یہودی کے حق میں دے دیا۔ یہ وجہ ہے جو ہماری تاریخ میں اس قسم کے واقعات بھی "بلاشہ سرخیوں" کے مذکور ہیں۔ جنہیں پڑھ کر (فرطِ حیرت سے) ہماری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں، اور ہم انہیں "خوارقِ عادات" میں شمار کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ مثلاً:۔

(۱) امیر المؤمنین حضرت عمرؓ نے ایک شخص سے پسند کی شرط پر گھوڑا خریدا اور امتحاناً اس پر سوار ہوئے۔ گھوڑا چوٹ کھا کر داعی ہو گیا۔ آپ نے اسے واپس کرنا چاہا۔ مالک نے انکار کر دیا۔ آپ نے کہا کہ اس معاملہ میں تصفیہ کے لیئے کوئی ثالث مقرر کر لو۔ اس نے کہا کہ یہ "شریح" کو ثالث ٹھہراتا ہوں۔ انہوں نے ماجرا سنا تو کہا کہ امیر المؤمنین! یا گھوڑا خریدیئے اور یا جیسا وہ تھا ویسا ہی اُسے واپس کیجئے۔ آپ اس فیصلہ پر بہت خوش ہوئے اور (حضرت) شریح سے کہا کہ آپ منصب قضا کے لیے نہایت موزوں ہیں۔ یہی ہیں کوفہ کے وہ مشہور قاضی شریح جنہوں نے ساٹھ برس تک اس فریضہ کو بکمال حسن و خوبی سرانجام دیا۔

(۲) اس سے بھی آگے بڑھیئے۔ حضرت عمرؓ ایک مقدمہ میں بہ حیثیت مدعی علیہ حضرت زیدؓ بن ثابت کی عدالت میں پیش ہوئے۔ انہوں نے آپ کو تعظیماً بٹھانا چاہا تو آپ نے ان سے کہا کہ زید! تم سے انصاف کی توقع کس طرح کی جا سکتی ہے جب تم نے ابتدا ہی میں فریقین میں امتیاز کرنا شروع کر دیا ہے۔ یہ کہہ کر آپ مدعی کے قریب بیٹھ گئے۔ آپ کو دعوے سے انکار تھا۔ فریقِ مخالف (ابی بن کعب) نے آپ سے حلف لینے کو کہا۔ حضرت زیدؓ نے مدعی سے کہا کہ امیر المؤمنین سے حلف نہیں لینی چاہیئے۔ اس پر حضرت عمرؓ سخت برافروختہ ہوئے اور کہا کہ زید! تم منصبِ قضا کے اہل نہیں۔ جو قاضی کسی فریقِ مقدمہ کی پوزیشن کا خیال رکھے وہ انصاف نہیں کر سکتا۔

(۳) ایک یہودی نے حضرت علیؓ کے خلاف حضرت عمرؓ کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ حضرت علیؓ نسبتاً ممتاز جگہ پر بیٹھ گئے تو آپ نے کہا کہ ابو الحسن! اٹھو اور اپنے مدعی کے برابر جا کر بیٹھ جاؤ۔ حضرت علیؓ اٹھے اور فریقِ مقابل کے قریب جا کر بیٹھ گئے۔ لیکن آپ کے چہرے پر برافروختگی کے آثار تھے۔ مقدمہ ختم ہونے پر حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ فریقِ مقابل کے برابر بیٹھنا آپ کو ناگوار گذرا تھا؟ آپ نے فرمایا کہ عمرؓ! مجھے یہ قطعاً ناگوار نہیں گذرا۔ ناگوار یہ گذرا کہ تم نے میرا نام لینے کے بجائے مجھے میری کنیت (ابو الحسن) سے پکارا اور فریقِ مقابل کو اس کے نام سے۔ اس سے تم نے جو عدمِ مساوات کا ثبوت دیا ہے مجھے وہ ناگوار گذرا تھا۔ (عربوں میں، کسی کو نام کے بجائے کنیت سے پکارنا اس کی تعظیم پر دلالت کرتا تھا) یہ تھا عدل کا معیار اس دور میں!

غرضیکہ ہمارے صدرِ اول کی تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے جن میں عام لوگوں کی طرف سے دائر کردہ مقدمات میں سربراہانِ اقتدار کے خلاف فیصلے دیئے گئے اور نہ صرف یہ کہ انہیں یہ قطعاً ناگوار نہ گذرا بلکہ

انہوں نے قاضی کی تعریف و تحسین کی۔

تاریخ کے اس قسم کے واقعات پیش کرنے کے بعد جب پوچھنے والے پوچھتے ہیں کہ اب اس قسم کے کردار کا ثبوت کیوں نہیں ملتا تو مودودی صاحبان تو آسانی سے یہ کہہ کر جان چھڑا لیتے ہیں کہ:۔

اللہ تعالیٰ نے ہم سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ ہم ابوبکر صدیق رضؓ اور حضرت عمر رضؓ کی حکومت کی طرح ایک حکومت قائم کر دیں۔ نہ بندوں کو اس کی طاقت حاصل ہے نہ خدا نے اس کی تکلیف دی ہے۔ (جماعتِ اسلامی کے سابقہ ممتاز زاہ نما، مولانا امین احسن اصلاحی۔ بحوالہ ماہنامہ چراغِ راہ۔ بابت مئی ۱۹۵۳ء)

لیکن ہم تو اتنے سستے نہیں چھوٹ سکتے۔ ہم جانتے ہیں کہ ابوبکر کو حضرت صدیق رضؓ اور عمرؓ کو حضرت فاروقؓ قرآن کریم کی تعلیم نے بنایا تھا، اور قرآن کریم میں آج بھی یہ صلاحیت موجود ہے (اور قیامت موجود رہے گی) کہ جو اس پر عمل کرے اس میں اس قسم کا کردار پیدا ہو جائے۔ قرآن کریم نے عدل کی جس قدر تاکید کی ہے اس کے متعلق تفصیل سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ وہ کہیں کہتا ہے کہ:۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (۱۶/۹۰)

خدا عدل و احسان کا حکم دیتا ہے۔

کہیں ارشاد ہے:۔

اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (۵/۸)

عدل کرو، کیونکہ یہ روشِ تقویٰ سے قریب تر ہے۔

کہیں کہا ہے کہ خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ:۔

اِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ (۴/۵۸)

جب لوگوں کے تنازعہ جیسے امور کا فیصلہ کرو تو ہمیشہ عدل کی رو سے فیصلہ کرو۔ اور یہ عدل اپنوں ہی سے نہیں ہوگا، غیروں سے بھی ہوگا، حتیٰ کہ دشمنوں سے بھی کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ:۔

وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا (۵/۸)

دیکھنا! کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو۔ اور ہر ایک سے عدل کرو۔

یہ تو ہے عدل کی تاکید۔ باقی رہا عدل کا معیار، تو اس باب میں قرآن کریم نے ایک ایسا پیمانہ مقرر کیا ہے، جس کی نظیر دنیائے عدل و انصاف میں شاید ہی کہیں مل سکے۔ عدل کا مدار شہادات پر ہے اور شہادت کے متعلق اس نے کہا ہے کہ:۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ۔ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ۔ اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِھِمَا۔ فَلَا تَتَّبِعُوا الْھَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا۔ وَاِنْ تَلْوٗٓا

أَوْ تُعْرِضُوا - فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا - (۴/۱۳۵)

اے جماعتِ مومنین! تم قیامِ عدل کے ذمہ دار بن کر رہو۔ کسی معاملہ میں شہادت دینی ہو تو نہ مدعی کی طرف سے گواہ بن کر آؤ، نہ مدعیٰ علیہ کی طرف سے۔ تم خدا کی طرف سے گواہی دینے کے لیے آؤ۔ بات ہمیشہ سچی کہو۔ خواہ وہ خود تمہارے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔ تمہارے خلاف یا تمہارے والدین کے خلاف، یا تمہارے رشتے داروں کے خلاف۔ یہ مت دیکھو کہ فریقین میں کون غریب ہے کون امیر۔ تم تو خدا کی طرف سے گواہ بن کر آئے ہو۔ اس لیے تم ان کی پوزیشن کا خیال مت کرو۔ خدا کا قانون خود دیکھ لے گا کہ فیصلہ کس کے حق میں جانا چاہیئے۔ بڑے محتاط رہو کہ کہیں تمہارے جذبات حق گوئی کے راستے میں حائل نہ ہو جائیں۔ جب بات کرو، صاف صاف، واضح، دو ٹوک بات کرو۔ نہ توڑ مروڑ کر بات کرو اور نہ ہی سچی گواہی دینے سے اعراض برتو یاد رکھو! جو کچھ بھی تم کرتے ہو، اللہ اس سے باخبر ہوتا ہے۔

لیکن جب ہم قرآن کریم کے اس قسم کے احکام پیش کرتے ہیں تو مخالفین کہتے ہیں کہ جب تمہارے ان اس قسم کا ضابطۂ عدل موجود ہے۔ مملکت تمہاری اپنی ہے جس میں تمہیں ہر قسم کا اقتدار اور اختیار حاصل ہے۔ مملکت نے یہ بھی اعلان کر دیا ہے کہ اس کا مذہب اسلام ہے، اور اس کا ہر فیصلہ اور قانون حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے کتاب و سنت کے مطابق ہو گا۔ تو پھر تمہارے ہاں اس قسم کا کردار کیوں نہیں ملتا! اس میں کونسا امر مانع ہے؟ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ کیا اس سے انسان اس نتیجہ پر نہیں پہنچتا کہ قرآن میں اب (معاذ اللہ) اس کی صلاحیت ہی نہیں کہ وہ اس قسم کا کردار پیدا کر سکے؟ ..... اس اعتراض پر ہماری حالت اس محوِ رقص و سرود طاؤس (مور) کی سی ہو جاتی ہے جو اپنے پاؤں دیکھ کر سب کر ندامت بن جاتا ہے۔ اس کی آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ ٹپکتا ہے جس میں اس کی ساری رنگینیاں اور رعنائیاں ڈوب کر رہ جاتی ہیں اور وہ یہ کہہ کر ویرانوں کی طرف نکل جاتا ہے کہ:

مرا اے کاشکہ مادر نزادے!

ایک قیمتی گوہر چھن گیا

رفیق محترم عبداللہ جمال پیدائشی ہندو (برہمن) تھے۔ علیٰ وجہ البصیرت حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔ رفیقۂ حیات (محترمہ بہن ملیحہ) قرآن کی شیدائی بلکہ فدائی تھیں۔ ان کی تعلیم سے یہ نو مسلم کسی فرقہ سے متمسک ہوئے بغیر خالص مسلم بنے۔ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میاں بیوی دونوں کی زندگی کا مشن تھا۔ پہلے کراچی میں سرگرم عمل رہے۔ پھر لاہور منتقل ہو کر اسی جدوجہد میں مصروف۔ اچانک بیمار ہوئے اور چند روز کی علالت کے بعد ۲۷ مئی کو انتقال کر گئے۔ احباب ان کے غم میں سوگوار اور ان کی رفیقۂ حیات اس صدمہ سے مضطرب و بے قرار ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ہماری غمزدہ بہن اور ان کی بچی کو اس صدمہ کے برداشت کرنے کی توفیق عنایت کرے۔

(احباب ادارہ طلوعِ اسلام)

اقبالؒ کے خلاف سازش

کا سلسلہ جاری) ہے۔ یہ سازش درحقیقت خود پاکستان کے خلاف ہے۔ اگر پاکستان سے اقبالؒ کی فکر اور پیغام کو نکال دیا جائے تو اس میں اور کسی سیکولر اسٹیٹ (مثلاً روس یا بھارت) میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔

۲۔ اقبالؒ کی فکر کا سرچشمہ قرآنِ حکیم ہے۔ اس لیے اقبالؒ کی فکر کو مسخ کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ قرآنی نظامِ حیات کا صحیح تصور نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔

۳۔ اندریں حالات اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ فکرِ اقبالؒ کو قرآن حکیم کی روشنی میں عام کیا جائے۔

۴۔ اس مقصد کو مفکرِ قرآن پرویز صاحب بطریقِ احسن پورا کر سکتے ہیں کہ انہوں نے اقبالؒ کا مطالعہ اسی نقطۂ نظر سے کیا ہے۔

۵۔ کوئی بیس سال اُدھر ادارہ طلوعِ اسلام نے علامہ اقبالؒ سے متعلق پرویز صاحب کے خطابات اور مقالات کا مجموعہ:۔

اقبالؒ اور قرآنؐ

کے نام سے شائع کیا تھا۔ وہ مجموعہ بھی مدت سے نایاب تھا اور اس دوران میں پرویز صاحب نے علامہ اقبالؒ سے متعلق مزید بہت کچھ کہا اور لکھا ہے۔ چنانچہ اب اس کا نیا ایڈیشن (۱۹۳۸ء سے ۱۹۷۵ء تک) مکمل کر کے نہایت حسن و خوبی سے شائع کیا گیا ہے۔

ضخامت (بڑی تقطیع کے) قریب تین سو صفحات۔ کاغذ عمدہ سفید۔ جلد پائیدار۔ گرد پوش دیدہ زیب
قیمت پچیس روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ:۔

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور — مکتبہ دین و دانش۔ چوک اردو بازار لاہور

شہرۂ آفاق کتابیں جن سے صحیح اسلام سمجھ میں آسکتا ہے

۱۔ امن و یزداں

خدا پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے۔ قرآن، دیگر اہلِ مذاہب کے خدا پر ایمان کو ایمان کیوں تسلیم نہیں کرتا قرآن، خدا کا کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس خدا کا ہمارے ساتھ کیا تعلق ہے۔

قیمت مجلد۔ پچیس روپے

۲۔ ابلیس و آدم

پہلا انسان کس طرح وجود میں آیا۔ قصہ آدم کا مفہوم کیا ہے ابلیس و آدم کی کشمکش، شیطان، ملائکہ، جنات، وحی، نبوت، رسالت جیسے اہم بنیادی نظریات کا صحیح تصور، علومِ عاصرہ کی روشنی میں۔

قیمت مجلد۔ بیس روپے

۳۔ جوئے نور

حضرات انبیاء کرامؑ اور اقوامِ سابقہ کی سرگزشتیں، آسمانی انقلاب کے خلاف مفاد پرست گروہوں کا محاذ۔ ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داروں کی تباہ کاریاں۔ (حضرت نوحؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک)

قیمت مجلد۔ بیس روپے

۴۔ برقِ طور

صاحبِ ضربِ کلیمؑ اور فرعونیت کی آویزش۔ داستانِ بنی اسرائیل، خوبیوں کے عروج و زوال کے ابدی اصول شوکتِ سلیمانی اور سطوتِ داؤدی۔ یہودی ذہنیت اور اس کا انجام۔ کیا یہودیوں کی مملکت کبھی قائم نہیں ہوسکتی؟ ارضِ مقدس کی داستان۔

قیمت مجلد۔ بیس روپے

۵۔ شعلۂ مستور

حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے کوائفِ حیات۔ کیا حضرت عیسیٰؑ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ کیا وہ زندہ آسمان پر تشریف فرما ہیں۔ کیا وہ پھر سے زمین پر اتریں گے؟ واقعہ تصلیب کی حقیقت کیا ہے؟ قرآن کریم اور عصرِ حاضر کے محققین کے نزدیک۔ بصیرت افروز حقائق حقیقت کشا معلومات۔

قیمت مجلد۔ پچیس روپے

۶۔ ختمِ نبوت اور تحریکِ "احمدیت"

مقامِ نبوت کیا ہے؟ ختمِ نبوت کی حقیقت اور اہمیت کیا ہے؟ سلسلۂ وحی کیوں بند کیا گیا؟ رسالتِ محمدیہ کس طرح ابدیت سے ہمکنار ہے۔ "آنے والے" کا عقیدہ کس طرح پیدا ہوا۔ تحریک "احمدیت" کی اصل حقیقت اور غرض و غایت۔ "احمدی" لٹریچر کا بے لاگ تجزیہ اور نتیجہ۔ بڑی اہم کتاب ہے۔

قیمت مجلد۔ پندرہ روپے

(نوٹ:۔ قیمتوں میں محصول ڈاک شامل نہیں)

ملنے کے پتے (۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش۔ چوک اردو بازار لاہور

اب "بہائی" آگے بڑھے

پرویز

میری زندگی کا مشن اپنی ملت (یعنی امتِ محمدیہ جس کا ایک ادنیٰ فرد ہونے کا مجھے شرف اور فخر حاصل ہے) کے سامنے اُن ابدی صداقتوں اور غیر متبدل حقیقتوں کو ابھار اور نکھار کر پیش کرنا ہے جو خدا کی کتابِ عظیم قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ ہیں، لیکن جنہیں ہم نے صدیوں سے فراموش کر دیا اور پسِ پشت ڈال رکھا ہے۔ جس کا نتیجہ تباہیوں اور بربادیوں کا وہ جہنم ہے جس میں ہم ماخوذ چلے آرہے ہیں۔ اس مقصد کے لیے میں نے گذشتہ قریباً بیس برس سے جو کچھ کیا ہے وہ ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح قوم کے سامنے ہے، اور اس سے جو نتائج مرتب ہوئے ہیں ان سے میرے اس ایمان اور یقین کی تائید ہوتی ہے کہ جو شخص غور و تدبر اور علم و بصیرت کی روشنی میں قرآنی حقائق کو سمجھ لے دنیا کا کوئی مذہب اور کوئی ازم اسے گمراہ نہیں کر سکتا۔

میں نے اپنی ابتدائی زندگی میں غیر مذاہب والوں سے مناظرے بھی کیے اور مباحثے بھی۔ لیکن جب سے میں نے مذکورہ بالا نصب العین (اور مشن) کو اپنے سامنے رکھا، غیر مذاہب کے متعلق بہت کم لکھا ہے۔ اور جو کچھ لکھا ہے وہ بھی اس حد تک جس تک قرآن مجید کے کسی دعوے کی صداقت کے اثبات یا تائید کے لیے ضروری تھا۔ اس سے زیادہ کی نہ ضرورت تھی اور نہ ہی مجھے فرصت۔ میرے پیشِ نظر مقصد تو اس قدر وسیع ہے کہ اس کے کما حقہٗ حصول کے لیے کتنی عمریں درکار ہوں گی۔ اس لیے میں نے اپنی عمر کا ایک ایک لمحہ اس کے لیے وقف کر رکھا ہے۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ میں غیر مذاہب میں (صحیح) اسلام کی تبلیغ کا قائل نہیں۔ وہ بھی اپنی جگہ ضروری ہے۔ لیکن تقسیمِ کار کے حصول کے مطابق میں نے اپنے لیے یہی راستہ تجویز کیا ہے اور اسی پر گامزن ہوں۔ خدا مجھے اس کی توفیق عطا فرمائے کہ میں آخری دم تک اس پر گامزن رہوں۔

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است

ہمارے دَور میں دو نئے مذاہب پیدا ہوئے۔ ایران میں "بہائیت" اور ہندوستان میں "احمدیت" (جسے عرفِ عام میں مرزائیت کہا جاتا ہے) مندرجہ بالا اصول کے مطابق میں نے بہائیت کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ لیکن "احمدیت" کے متعلق بہت کچھ لکھا اور کہا۔ یہ اس لیے کہ "احمدیت" اسلام سے الگ مذہب ہونے کے باوجود مسلمانوں کو دھوکا دے رہی تھی کہ وہ مسلمانوں کا ایک فرقہ ہے۔ ان کی یہ نقاب پوش روش امتِ محمدیہ کے لیے بڑی خطرناک تھی اور اس کی مدافعت ازبس ضروری۔ "احمدیت" کے متعلق میں نے جو کچھ لکھا اس کا مطلب یہ ثابت کرنا تھا کہ یہ مسلمانوں کا ایک فرقہ نہیں۔

اسلام سے الگ ایک مذہب ہے۔ للہ الحمد کہ اس مقصد میں مجھے اصولی طور پر کامیابی حاصل ہوگئی اور آئینِ پاکستان کی رو سے "احمدیوں" کو غیر مسلم قرار دے دیا گیا۔ اگرچہ اس کے قانونی تضمنات کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

ان کے برعکس بہائیت کی یہ کیفیت نہیں۔ انھوں نے شروع ہی سے اپنے آپ کو مسلمانوں سے ایک الگ، ایک جداگانہ مذہب کے پیرو قرار دیا ہے۔ لہٰذا میں نے (اپنے پیشِ نظر مشن کی رو سے) ان سے تعرض نہیں کیا (ضمناً) "احمدیت" اور "بہائیت" کی بنیاد ایک ہی ہے۔ قرآن کا دعوے یہ ہے کہ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا - لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ..... (۶/۱۱۶) "خدا نے جتنی باتیں (کلام) انسانوں سے کرنی تھیں وہ (اس قرآن میں) اتمام تک پہنچ گئیں۔ لہٰذا ان میں اضافہ کے لیے خدا کو کسی انسان سے مزید باتیں کرنے (ہم کلامی) کی ضرورت نہیں۔ اور چونکہ یہ باتیں غیر متبدل ہیں اس لیے اس کی بھی ضرورت نہیں کہ وہ ان میں تبدیلی کیلئے کسی مامور کو بھیجے۔ یہ ہے ٹھہرا اور نکھرا ہوا قرآن کا وہ مقام جس پر ایمان لانے سے ایک شخص اُمتِ محمدیہ کے زمرہ میں داخل ہوتا اور اسلام کا پیرو کہلاتا ہے۔ جو شخص قرآن کے ان دعاوی میں سے کسی کا بھی انکار کرتا ہے نہ وہ اُمتِ محمدیہ کا فرد رہتا ہے، نہ اسلام کا پیرو۔

میرزا غلام احمد نے کہا کہ خدا کی باتیں ختم نہیں ہوگئیں۔ وہ مجھ سے ہم کلام ہوتا ہے اور دین سے متعلق انواع و اقسام کی باتیں کرتا ہے۔ ان میں ایک بات یہ بھی ہے کہ اس نے قرآن کریم میں جو جہاد بالسیف (قتال) کا حکم دیا تھا، اسے اب منسوخ کیا جاتا ہے۔ اس دعوے کی رو سے، قرآن کریم مکمل رہا نہ غیر متبدل۔ لہٰذا اس دعوے کا مدعی ایک جدید مذہب کا بانی اور اس کے ماننے والے ایک نئے مذہب کے پیرو قرار پا گئے۔

ایران کے بہاء اللہ نے یہی بات کھل کر اور نکھر کر کہی۔ اس نے کہا کہ قرآن ایک خاص دور تک کے لیے ضابطۂ ہدایت تھا۔ وہ دور ختم ہو گیا ہے اور ایک نئی کتاب اور نئے ظہور کا دور شروع ——— لہٰذا یہ بھی ایک نیا مذہب ہے۔

میں نے (اس چالیس سال کی محنت و کاوش سے) اپنی بصیرت و بساط کے مطابق، یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن کریم تمام نوعِ انسان کے لیے، قیامت تک، مکمل اور غیر متبدل ضابطۂ حیات ہے۔ لہٰذا رسالتِ محمدیہ ابد در کنار ہے۔ اسی کو ختمِ نبوت کہا جاتا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ جو شخص قرآن کریم کے متعلق علیٰ وجہ البصیرت، یہ ایمان رکھے، وہ نہ "احمدیت" کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکتا ہے نہ بہائیت (یا اسی قسم کی کسی اور ایت) کی طرف۔ یہ وجہ ہے کہ مجھے ان سے براہِ راست الجھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ (احمدیت کے متعلق میں نے اتنا کچھ کیوں کہا، اس کی بابت اوپر بتایا جا چکا ہے) جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ "بہائیوں" نے بھی مجھے کبھی براہِ راست مخاطب نہیں کیا اور میں نے بھی انہیں درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ لیکن اب انھوں نے اپنے ہاں ایک نئے انداز سے میرا ذکر شروع کیا ہے۔ جس کی طرف ایک دوست نے میری خصوصی توجہ مبذول کرائی ہے۔ کراچی سے بہائیوں کا ایک ماہنامہ شائع ہوتا ہے۔ جس کا نام ہے "بہائی میگزین"۔ اس کی اشاعت بابت مارچ ۱۹۷۵ء میں ایک مقالہ (یا شذرہ) شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے۔ "قیامت یا جہانِ فردا"۔ اس کا ابتدائیہ درج ذیل ہے۔

"جب سے دنیا میں بہائی تعلیمات کی نشریات شروع ہوئی ہیں مفکرین کے عقول و افکار میں انقلاب آگیا

ہے۔ جیسا کہ حضرت مسیح کے زمانۂ ظہور میں حضرت مسیح کی تعلیمات کے اثرات دنیا میں پھیلے تو علماءِ عالم کے ذہن پر ان کے نشانات ابھرنے لگے، جب اسلامی حقائق و معارف دنیا میں پھیلے تو مختلف قوموں اور ملکوں کے علماء و فضلاء متاثر ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ مشیتِ غیبی سے عقول و اذہانِ عالم پر اس طرح اثرات کا نمودار ہونا ایک قانونِ فطرت ہے، آج عصرِ جدید میں بھی یہی قانونِ قدرت اثر انداز ہے۔

دین کے اہم مسائل میں سے قیامت ایک اہم ترین مسئلہ ہے۔ قیامت اسی دنیا میں قوموں کی نشأت ہے۔ اس حقیقت کا بیان تورات و انجیل اور قرآن مجید میں نہایت خوبی سے فرمایا ہے۔ لیکن دین سے غفلت کے باعث لوگ اس حقیقت کو بھول گئے۔ اب جبکہ آنے والی قیامت موعود جلوہ گر ہو گئی اور اس کی حقیقت آشکارا فرما دی گئی اور بہائی لٹریچر میں نہایت تفصیل سے قیامت کے متعلق بیانات شائع ہوئے تو قیامت حشر اور ساعت کے متعلق بہت سے علماء عالم اور مفکرین نے ان حقائق پر غور کیا تو پھر ان مفکرین کے بہت سے بیانات میں قیامت کی وہ حقیقت جھلکنے لگی جو معقول اور مشہود ہے۔

جب حضرت علامہ علمی کی کتاب قیامت شائع ہوئی تو کئی اہلِ علم نے اس پر توجہ فرمائی۔ جناب محترم غلام احمد پرویز بھی ایک مفکرِ قرآن ہیں۔ انہوں نے کتاب قیامت پر ریویو کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ "بیشک قرآن مجید میں قیامت قوموں کی نشأۃ ثانیہ کا نام ہے۔" پھر اب چند سال بعد موصوف نے کتاب "جہانِ فردا" ایک اچھی کتاب لکھی ہے جو بہت مفید ثابت ہوگی۔ ہمارے ناظرین کرام "جہانِ فردا" کو پڑھ کر بہت خوش ہوں گے کہ کتاب قیامت اور "جہانِ فردا" اس حقیقت پر متفق ہیں کہ قیامت قوموں کی نشأت اور نئی اُمتوں کی پیدائش ہے جو "جہانِ فردا" کے الفاظ میں صاحبانِ مستقل اقدار" اور کتاب قیامت کے الفاظ میں صاحبانِ شریعتِ مستقلہ کے ذریعے رونما ہے (اگرچہ علامہ پرویز نے دیگر انقلابی تحریکات کو بھی قیامت کہا ہے)

اس تحقیق سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ہم پسند کیا کہ "جہانِ فردا" کے کچھ اقتباسات یہاں درج کریں تاکہ مفکرین اور مبصرین خوش ہوں اور سب لوگ فائدہ اٹھائیں۔"

ان اقتباسات کی اگلی قسط انہوں نے اپنی اشاعت بابت مئی ۱۹۷۵ء میں شائع کی ہے۔

ہمارا دورِ میکیاولی سیاست کا ہے۔ جس میں کذب و افترا اور کتمان و تلبیس حصولِ مقاصد کے لیے ضروری ذرائع قرار دیئے گئے ہیں۔ یہ روش اس قدر عام ہو گئی ہے کہ اعیانِ سیاست ہی نہیں، ارباب مذہب نے بھی یہی حربے استعمال کرنے شروع کر دیئے ہیں۔ یہی کچھ بہائی میگزین نے ان اقتباسات کے پیش کرنے میں کیا ہے۔ سب سے پہلے مجھے کہ اس میں کہا گیا ہے کہ میں نے علمی صاحب کی کتاب "قیامت" پر ریویو کیا تھا۔ دہلی (مرحوم) یا شاید کراچی میں، علمی صاحب سے دو ایک ملاقاتوں کے دھندلے سے نقوش تو میرے ذہن پر ضرور ہیں لیکن مجھے قطعاً یاد نہیں پڑتا کہ میں نے ان کی کتاب "قیامت" پر کبھی ریویو لکھا ہو۔ "بہائی میگزین" کو چاہیئے تھا کہ اس کا حوالہ دیتا تاکہ میں (اور قارئین) دیکھ سکتے کہ میں نے اس ضمن میں کیا کہا تھا۔ اس نے ایسا نہیں کیا۔

اس ضمنی بات کے بعد اصل موضوع کی طرف آیئے۔ بہائیوں کا عقیدہ ہے کہ قیامت سے مراد اسی دنیا میں قوموں

کا انقلاب اور ایک "نئے ظہور" کا قیام ہے۔ اُخروی زندگی سے اس کا کچھ تعلق نہیں۔ اس کے برعکس میں نے اپنی "لغات القرآن" اور "جہانِ فردا" دونوں میں قیامت کے متعلق لکھا ہے کہ اس سے مراد، اس دنیا میں قوموں کی نشاۃِ ثانیہ بھی ہے اور مرنے کے بعد قوموں کی زندگی بھی۔ آپ، پہلے لغات القرآن کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ اس میں (مادہ، ق۔ و۔ م کے تحت) لکھا ہے۔

"قیامۃ" کا لفظ قرآن کریم کی ان بنیادی اصطلاحات میں سے ہے جن کا مفہوم بڑا جامع ہوتا ہے — جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے (امام راغب کے قول کے مطابق) اس کا مفہوم ہے ایسا قیام جو یکبارگی واقع ہو جائے۔ اس دنیا میں قیامۃ کسی قوم کی وہ نشاۃِ ثانیہ (حیاتِ جدید) ہے جو انقلاب کی رو سے ظہور میں آئے۔ یعنی وہ قوم یکبارگی اُٹھ کھڑی ہو اور مرنے کے بعد دوسری زندگی تو ہے ہی ایک انقلابی ظہور۔ قیامت، آخرت، ساعت، بعث وغیرہ الفاظ کا مفہوم قرآن کریم کے مختلف مقامات میں سامنے آجاتا ہے۔ ان مقامات میں یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ متن کے اعتبار سے متعلقہ لفظ کے معنی اس دنیا میں انقلاب اور نشاۃ ثانیہ ہیں یا اُخروی زندگی کا بعث و قیام۔ (لغات القرآن جلد سوم صـ۱۴۰۱)

لفظ قیامت کے اس مفہوم کی روشنی میں میں نے اپنی کتاب "جہانِ فردا" میں لکھا۔

انسان کے "اُٹھ کھڑے ہونے" کا مقام یہ دنیا بھی ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی بھی۔ اس دنیا میں مستبد قوتیں کمزوروں اور ناتوانوں کو اس طرح دبائے رکھتی ہیں کہ ان میں اُٹھنے کی سکت تو ایک طرف، اس کا تصور تک پیدا نہیں ہوتا، لیکن رفتہ رفتہ حالات بدلتے چلے جاتے ہیں۔ تاآنکہ ایک ہنگامہ خیز انقلاب آتا ہے اور یہی دبی ہوئی انسانیت یکبارگی اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ یہ اس دنیا میں قیامت ہے۔ یہ انقلاب اگر اس جماعت کے ہاتھوں رونما ہو جو مستقل اقدارِ خداوندی کی حامل ہے تو معاشرہ میں ظلم و ستم کی جگہ عدل و احسان کا دور دورہ ہوگا۔ ہر ایک کو اس کی محنت کا پورا پورا صلہ ملے گا۔ کوئی اسے غصب نہیں کر سکے گا۔ ہر معاملہ کا فیصلہ قوانینِ خداوندی کے مطابق ہوگا۔ حق، باطل پر غالب آجائے گا۔ اس قسم کا انقلاب نبی اکرم ؐ اور حضور کے رفقاءؓ کے ہاتھوں اس قدر نمایاں طور پر رونما ہوا تھا جس کی نظیر تاریخ کے صفحات پر نہیں ملتی۔ قرآن کریم نے اسے بھی القیامۃ سے تعبیر کیا ہے۔ (جہانِ فردا صـ۱۳۲)

اس کے بعد میں نے قرآنِ کریم کی ان آیات کو درج کیا ہے جو القیامۃ کے اس مفہوم کی مؤید ہیں۔ ازاں بعد میں نے لکھا ہے۔

اب ہم ان آیات کی طرف آتے ہیں جن سے مستنبط ہوتا ہے کہ قیامت سے مراد مرنے کے بعد کی زندگی میں اُٹھ کھڑے ہونا بھی ہے۔ (ایضاً صـ۱۳۵)

اور اس کے بعد میں نے کتنے ہی صفحات پر اس (مرنے کی بعد کی) قیامت کی تفاصیل اور ان کی مؤید قرآنی آیات درج کی ہیں۔

"بہائی میگزین" نے چن چن کر ان مقامات کو اپنے مقالہ میں درج کر دیا ہے۔ جن کا تعلق اس دنیا میں قیامت کے مفہوم سے ہے اور ان مقامات کا ذکر تک نہیں کیا جن سے واضح ہوتا ہے کہ القیامۃ سے مراد مرنے کے بعد کی زندگی (حیاتِ آخرت) ہے اور اس طرح اپنے قارئین کو اس فریب میں مبتلا کرنے کی کوشش کی ہے کہ:۔

یہ کتاب (جہانِ فردا) بہائی کتاب قیامت کی ہمنوا اور مماثل ہے۔ (بہائی میگزین۔ بابت مئی ۱۹۷۵ء صـ۳۵)

یہ ہے ان حضرات کی دیانت کا عالم!

میں ان سے گذارش کروں گا کہ آپ اپنے مذہب کی تبلیغ جس طرح جی چاہے کریں، لیکن اس میں مجھے تو نہ گھسیٹیں۔ میرے حال پر رحم فرمائیں — اور اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میری "تائید" کے بغیر آپ کا نام نہیں چلتا، تو میں نے اپنی کتاب "جہانِ فردا" میں جو کچھ قیامت، حشر، نشر، جنت، جہنم، حیات، آخرت کے متعلق لکھا ہے اسے پورے کا پورا درج کریں اور اس کی ابتدا اس سے کریں کہ میرے اس مقالہ کو اپنے ہاں شائع کریں۔ اپنے مطلب کے مطابق قطع و برید (مذہب تو ایک طرف) صحافتی دیانت بھی نہیں کہلا سکتی۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے طلوعِ اسلام میں بہائیت کا ذکر (آج سے بیس سال پہلے) ایک بار آیا تھا اور وہ بھی کسی صاحب کے استفسار کے جواب میں۔ اب جب (خواہی نخواہی) بہائیت کی بات چھڑ ہی گئی ہے، تو میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس استفسار اور اس کے جواب کو یہاں درج کر دیا جائے۔ اسے غور سے دیکھئے۔ ہفت روزہ طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت ۱۹ مارچ ۱۹۵۵ء کے باب المراسلات میں لکھا تھا۔

"ایک صاحب لکھتے ہیں کہ آج کل یہاں "بہائی" تحریک بڑے زور شور سے چل رہی ہے۔ بہائی مبلغ علی صاحب، قرآن کی تفسیر سے بہائیت کی تبلیغ و اشاعت کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قیامۃ کے معنی ایک "ظہور" کے ہیں اور بکل امۃ اجل کے مطابق امتِ محمدیہ کی مدتِ حیات ختم ہو چکی ہے۔ اس کے بعد ہمارے دوست لکھتے ہیں کہ آپ قیامۃ اور آخرت کے متعلق طلوعِ اسلام میں بہت جلد کچھ لکھئے۔ تاکہ لوگ بہائیت کے اس خطرے سے محفوظ رہ سکیں۔

اس قلبی اضطراب کا احترام کرتے ہوئے جس کے ماتحت یہ خط لکھا گیا اور طلوعِ اسلام سے یہ تقاضا کیا گیا ہے۔ ہم ایک اصولی بات پیش خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ طلوعِ اسلام ایک عرصہ سے قرآن کریم کی تعلیم کو پیش کر رہا ہے۔ قارئین طلوعِ اسلام بھی ایک عرصہ سے قرآن سے قریب تر ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم پوچھتے یہ ہیں کہ (اگر اس سے پہلے نہیں تو کم از کم) اس تمام عرصہ میں آپ حضرات نے قرآن کے متعلق کیا یہی اندازہ لگایا ہے کہ یہ کتاب (معاذ اللہ) ایک خاص وقت اور خاص ماحول میں راہ نمائی دینے کے قابل تھی اور اب اس میں کچھ باقی نہیں رہا؛ کیا آپ نے رسالتِ محمدیہ کے متعلق یہی سمجھا ہے کہ وہ (نعوذ باللہ) تھوڑے سے عرصہ تک کے لیے زندہ رہ سکنے کے قابل تھی؛ اس کے بعد دنیا کو نئے ظہور کی ضرورت پیش آگئی ہے۔ جو شخص قرآن پر غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے۔ اس کے لیے اس کی بھی ضرورت نہیں کہ اسے کوئی بہائی یہ بتائے کہ قیامۃ کے یہ معنی ہیں۔ یا کوئی مرزائی یہ کہے کہ خاتم النبیین کا یہ مفہوم ہے۔ جب اس نے یہ سمجھ لیا ہے کہ (معاذ اللہ) قرآن کی راہ نمائی بے کار ہو چکی ہے اور رسالتِ محمدیہ کا دور ختم ہو چکا ہے تو اسے جہاں سے کوئی اور راہ نمائی مل سکتی ہے حاصل کرے۔ وہ کیوں ابھی تک (پناہ بخدا) اس فرسودہ مسلک کے ساتھ چمٹا ہوا ہے؛

لیکن اگر آپ کو دل کے پورے اطمینان کے ساتھ علیٰ وجہ البصیرت یہ یقین حاصل ہے کہ قرآن آج بھی اپنے اندر انسانی راہ نمائی کے لیے پورا پورا سامان رکھتا ہے۔ وہ کاروانِ انسانیت کا آج بھی امام بن سکتا ہے۔ وہ زندگی کے ہر مسئلہ کا حل دے سکتا ہے۔ اگر آپ اس عقیدہ کو ایک واقعہ نفس الامری سمجھتے ہیں کہ رسالتِ محمدیہ قیامت تک کے لیے زندہ و پائندہ اور درخشندہ و تابندہ رہے گی۔ تو آپ سوچئے کہ کیا آپ اتنی سی بات پر ایک نئی راہ نمائی کی ضرورت محسوس کرنے لگ جائیں گے اور ایک نئے نبی کی تلاش شروع کر دیں گے کہ کسی بہائی نے یہ کہہ دیا کہ قیامت کے معنی نیا ظہور ہیں یا کسی مرزائی نے یہ

کہہ دیا کہ خاتم کی "ت" زبر کے ساتھ ہے جس کے معنی مہر کے ہیں، گویا اتنے سے آپ کا وہ سارا ایقان اور اذعان ختم ہو جائے گا، کیا اتنی سی بات سے آپ کے ایمان میں لغزش آجائے گی اور آپ مضطرب و بے قرار ہو کر ادھر اُدھر بھاگنے لگ جائیں گے کہ کہیں سے اس مفہوم کی تردید مل جائے۔ ورنہ آپ کا اسلام ختم ہو جائے گا۔ اگر قرآن اور رسالتِ محمدیہ پر آپ کا ایمان ایسا ہی کمزور ہے تو پھر یقین مانیے کہ لفظ قیامۃ کا صحیح مفہوم یا خاتم کی "ت" کی زبر زیر کے عنکبوتی سہارے آپ کو کوئی کام نہیں دے سکیں گے۔

آپ کے لیے کرنے کا کام یہ ہے کہ آپ دل کے پورے اطمینان کے ساتھ سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیجیے کہ کیا قرآن آپ کے لیے کامل اور مکمل راہ نمائی اپنے اندر رکھتا ہے یا نہیں۔ اگر آپ کو اس پر پورا پورا یقین حاصل ہو جاتا ہے تو پھر کوئی بہائی یا مرزائی لاکھ زیروں زبروں کے تانے تنے۔ آپ اس سے صرف اتنا کہہ دیجیے کہ مجھے تمہاری ان منطقی موشگافیوں اور لغوی نکات آفرینیوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میرا ایمان ہے کہ قرآن کے بعد دنیا کو کسی اور راہ نمائی کی ضرورت نہیں اور نبی اکرم ؐ کے بعد نوعِ انسانی کے لیے کسی نبی کی حاجت نہیں۔ لہٰذا اگر تم اپنی سب باتیں (بزعم خویش) ثابت بھی کر دو تو بھی مجھے کسی نئے ظہور کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ لہٰذا تمہاری گفتگو ہی میرے لیے عبث و بیکار ہے۔ یاد رکھیے بہائیت یا مرزائیت اس لیے لوگوں کو اپنے پیچھے نہیں لگا لیتیں کہ ان کے دلائل محکم ہوتے ہیں۔ ان کے پیچھے صرف وہ لوگ لگتے ہیں جن کا قرآن کی ابدیت اور رسالتِ محمدیہ کی سرمدیت پر ایمان محکم نہیں ہوتا۔ جس کا ان پر ایمان محکم ہوتا ہے وہ یہ کہہ کر اس بحث کو آگے نہیں چلنے دیتا کہ "میرے نزدیک ختمِ نبوت کے سوال پر گفتگو کرنا ہی کمزوریٔ ایمان کی نشانی ہے"۔

اس کی وضاحت ایک مثال سے یوں ہو سکتی ہے۔ فرض کیجیے کہ کوئی صاحب آپ سے آکر کہتے ہیں کہ دیکھئے قرآن کی فلاں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ خدا ایک نہیں دو ہیں یا دو ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی فرض کیجیے کہ اس کی دلیل میں وہ صرف دنحو کے ایسے قاعدے پیش کرتا ہے جس کا آپ کے پاس جواب نہیں۔ تو کیا اس صورت میں آپ کا قرآن پر ایمان ختم ہو جائے گا ــ اور آپ قدم اوّل پر ہی یہ مان لیں گے کہ خدا دو ہیں اور وحدانیت کا تصور غلط ہے۔ اگر قرآن پر آپ کا ایمان علیٰ وجہ البصیرت ہے تو آپ کا ردِ عمل یہ ہوگا کہ یہ ٹھیک ہے کہ آپ نے اس آیت کی یہ توجیہہ بیان کی اور اس کے حق میں جو دلیل دی اس کا میرے پاس جواب نہیں۔ لیکن چونکہ قرآن کی تعلیمات کی اساس ہی وحدانیت پر ہے۔ اس لیے ہم یہ ماننے سے انکار کرتے ہیں کہ قرآن کی کسی آیت سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ خدا ایک سے زیادہ ہیں۔

اس سے یہ نتیجہ نہ نکالیے کہ آپ کا ایمان اندھا دھند ہونا چاہیے اور اس میں کسی معقول بات سننے کی گنجائش نہ ہونی چاہیے۔ آپ کا ایمان اتنا محکم ہونا چاہیے کہ وہ پہلے حملے میں ختم نہ ہو جائے۔ جہاں تک اعتراض کا تعلق ہے آپ ہم سے پوچھیے کہ یہ اعتراض ہمارے سامنے آیا ہے اور ہم اس کا جواب نہیں دے پائے۔ آپ سمجھائیے کہ حقیقت کیا ہے۔

لہٰذا آپ ہم سے یہ پوچھیے (اور ہزار بار پوچھیے) کہ قرآن کی راہ نمائی کس طرح کامل اور مکمل ہے۔ ہم اپنی بصیرت کے مطابق آپ کو سمجھانے کی کوشش کریں گے۔ آپ یہ پوچھیے کہ زندگی کے فلاں عقدہ کا حل قرآن نے کیا پیش کیا ہے۔ ہم بتانے کی سعی کریں گے۔ لیکن یہ نہ کیجیے کہ جہاں کسی بہائی نے کہہ دیا کہ قیامت کے یہ معنی ہیں۔ یا کسی مرزائی نے کہہ دیا کہ خاتم "ت" کی زبر کے ساتھ ہے۔ آپ سراسیمہ ہو کر بھاگ اٹھے کہ خدارا ہمارا ایمان بچائیے۔ قرآن کا دامن ہمارے ہاتھ سے چھوٹا جا رہا ہے۔ یہ ایمان نہیں بچوں کا غبارہ ہے۔ جو ذرا سی تیز ہوا سے پھٹ جایا کرتا ہے۔ (مزید تفصیل آئندہ اشاعت میں)

اس کے بعد طلوع اسلام بابت ۲۶ مارچ ۱۹۵۵ء میں لکھا تھا۔

"اشاعت سابقہ کے باب المراسلات میں ہم نے بہائیت اور مرزائیت کے متعلق ضمنی طور پر کچھ عرض کیا تھا۔ لیکن عدم گنجائش کی وجہ سے بحث تشنہ رہ گئی تھی۔ آپ غور کریں گے تو یہ حقیقت نمایاں طور پر آپ کے سامنے آجائے گی کہ بہائیت اور مرزائیت قسم کی تحریکیں دراصل مایوسی کی پیدا کردہ ہیں اور ایک آنے والے کا عقیدہ (جسے مسلمانوں نے مجوسیوں سے مستعار لیا ہے) انہیں ہوا دینے کا موجب ہے۔ یوں تو مسلمانوں کا زوال ایک عرصہ سے شروع ہو چکا تھا۔ لیکن گزشتہ (انیسویں) صدی میں مسلمانوں کے تمام ممالک اس قدر مصائب کا شکار ہو رہے تھے کہ ان کے سامنے نجات کا کوئی راستہ ہی نہیں رہا تھا۔ ان پیہم مصائب و نوائب سے چاروں طرف مایوسی ہی مایوسی پھیل رہی تھی۔ اس مایوسی سے یہ خیال پیدا ہوا کہ اسلام بہ حیثیت ایک زندہ مذہب کے ختم ہو چکا ہے۔ اب اس میں ابھرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی۔ اب مسلمانوں کو ایک نئے مذہب کی ضرورت ہے جس کے لیے ایک نئے ظہور کا وقت آچکا ہے۔ (یعنی وجہ مایوسی تھی مسلمانوں کی حالت، اور نتیجہ یہ اخذ کیا گیا کہ خود اسلام ہی بانجھ ہو چکا ہے) اسی کی وجہ سے ایران میں مرزا علی محمد باب اور بہاء اللہ کھڑے ہو گئے اور پنجاب میں مرزا غلام احمد نے ایک نئے ظہور کا دعویٰ کر دیا۔ دنیا میں ہر دعوے کے لیے دلائل مل جاتے ہیں۔ ان حضرات نے تو پھر بھی نبوت، مہدویت وغیرہ کے دعاوی کیے تھے۔ لوگ خدا بننے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اس کے لیے بھی دلائل پیش کرتے ہیں۔ اس دعوے میں بہاء اللہ کا مسلک مرزا غلام احمد سے زیادہ صاف اور دیانتدارانہ تھا۔ بہاء اللہ صاحب نے یہ کہا کہ ہر کتاب ایک متعین میعاد تک کے لیے ہوتی ہے۔ جب اس کی میعاد ختم ہو جاتی ہے تو وہ ریلوے کے پرانے ٹائم ٹیبل کی طرح منسوخ ہو جاتی ہے۔ اور اس کی جگہ ایک نئی کتاب لے لیتی ہے۔ قرآن کا وقت (معاذ اللہ) ختم ہو گیا ہے اب اس کی جگہ وہ کتاب آگئی ہے جو مجھے ملی ہے۔ مرزا صاحب نے بھی دعوے تو ایسا ہی کیا، لیکن اس کے ساتھ ہی کہا کہ میں نبی تو ہوں لیکن کوئی نئی کتاب نہیں لایا۔ حالانکہ "نبی بلا کتاب" کا تصور ہی بے معنی ہے۔ یہی وجہ ہے جو ہم نے کہا ہے کہ بہاء اللہ صاحب کا دعویٰ مرزا صاحب کی نسبت زیادہ "دیانتدارانہ" تھا۔ بہاء اللہ صاحب نے قرآن کو منسوخ کر کے جو نیا دین پیش کیا اس کی اصولی تعلیم یہ ہے۔

(۱) حق کی آزادانہ تحقیق۔ (۲) وحدتِ انسانیہ۔ (۳) محبت اور اخوت۔ (۴) تمام مذاہب اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہیں۔ (۵) مذہب اور سائنس کا اتحاد۔ (۶) عالمگیر امن۔ (۷) بین الاقوامی زبان۔ (۸) جبری تعلیم بالخصوص عورتوں کے لیے۔ (۹) مرد اور عورت کی مساوات۔ (۱۰) سب کے لیے کام۔ (۱۱) دولت اور غربت کی افراط کا مٹانا۔ (۱۲) خدا کی توحید (بہ حوالہ "بہائی مذہب اور اسلام" مصنفہ ایس، ایچ، قریشی) اور مرزا صاحب کی نبوت نے جو کچھ پیش کیا اس کا ملخص تھا۔ جہاد کی تنسیخ اور[۱] وفات مسیح۔

مسلمان برسوں سے مرزا صاحب (اور ان کی امت) کے ساتھ مناظرے کرتے چلے آرہے ہیں۔ جن میں ان کے دلائل کا رد پیش کیا جاتا ہے۔ اب شائد یہ سلسلہ بہائیت کے ساتھ شروع ہوگا۔ لیکن (جیسا کہ ہم سابقہ اشاعت میں کہہ چکے ہیں) اصل سوال ان کے دلائل کا نہیں۔ اصل سوال یہ ہے آیا قرآن اپنی راہ نمائی میں عاجز آچکا ہے یا اس میں یہ صلاحیت موجود

۱ـ جہاد کی تنسیخ مذہب بہائیت میں بھی شامل ہے۔

ہے کہ وہ تمام نوعِ انسانی کی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے راہ نمائی کر سکے۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ قرآن سے اب مزید راہ نمائی نہیں مل سکتی تو اسے جس جگہ سے نئی راہ نمائی مل سکتی ہو وہاں چلا جائے۔ البتہ یہ سمجھ لے کہ اس کے بعد اسے قرآن اور قرآن والوں کے ساتھ کوئی واسطہ باقی نہیں رہے گا۔ لیکن جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ ہماری راہ نمائی کے لیے قرآن کافی ہے اس کے لیے کسی نئے ظہور کے کسی دعوے اور اس دعوے کی کسی دلیل پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ بہائیوں کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ فنائے عالم کا عقیدہ غلط ہے۔ عالم اسی طرح سے رہے گا۔ لہٰذا قیامت کے معنی قوموں کا انقلاب ہے۔ جو ایک نئے ظہور کے ہاتھوں رونما ہوتا ہے۔ فرض کیجئے کہ فنائے عالم کا عقیدہ غلط ہے اور یہ بھی فرض کر لیجئے کہ قیامت سے مراد ایک عظیم الشان دنیاوی انقلاب ہے۔ تو جو شخص قرآن کی دوامی راہ نمائی کا قائل ہے۔ وہ کہہ دے گا کہ یہ عظیم الشان انقلاب قرآن ہی کے ذریعے رونما ہو گا۔ ان کی دوسری دلیل یہ ہوتی ہے کہ ہر قوم کے لیے ایک مدت متعین ہوتی ہے۔ مسلمانوں کی قوم کی مدت ختم ہو گئی ہے۔ اس لیے اب ایک نئی قوم اُٹھے گی۔ فرض کیجئے کہ یہ بھی ٹھیک ہے کہ جو قوم تاریخ میں مسلمان کے نام سے متعارف چلی آ رہی ہے۔ اس کی مدت ختم ہو چکی ہے۔ تو جو شخص قرآن کی استمراریت کا قائل ہے وہ کہے گا کہ اس کے بعد ایک اور قوم (جو ابھی تک مسلمان نہیں) اُٹھے گی اور اسی قرآن سے ایک نیا انقلاب پیدا کر دے گی۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کی طرف علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے کہ ؎

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است — سازِ قرآں را نوا ہا باقی است
زخمۂ ما بے اثر افتد اگر — آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور
ذکرِ حق از امتاں آمد غنی — از زمان و از مکاں آمد غنی
ذکرِ حق از ذکرِ ہر ذاکر جدا است — احتیاجِ روم و شام او را کجا است
حق اگر از پیشِ ما بردارد ش — پیشِ قومے دیگرے بگزاردش
از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن — ہر زماں جانم بلرزد در بدن !
ترسم از روزے کہ محرومش کنند — آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند

ہمارا چونکہ ایمان ہے (اور علیٰ وجہ البصیرت ایمان) کہ قرآن تمام نوعِ انسانی کے لیے ہمیشہ ہمیشہ تک کے لیے کامل راہ نمائی دینے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے اس لیے ہم کسی بہائی اور کسی مرزائی کی کسی دلیل پر وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ہاں یہ مسائل کہ عالم فنا آمادہ ہے یا نہیں، قیامت کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ اجلِ امت کا قرآنی مطلب کیا ہے۔ علمی مباحث ہیں جن پر بقدرِ الضرورت گفتگو کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں نہیں کہ ان مسائل کا کوئی تعلق کسی نئے ظہور کی آمد سے ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی اور ظہور کا تصور بھی ہمارے نزدیک توہینِ رسالت ہے جسے ہم قطعاً برداشت نہیں کر سکتے۔" (طلوعِ اسلام - بابت ۲۶ مارچ ۱۹۵۵ء - صفحہ ۱۶)

یہ ہے جو طلوعِ اسلام میں بہائیت سے متعلق ۱۹۵۵ء میں لکھا گیا تھا۔ اس دوران میں میں نے قرآنِ کریم

(باقی بر صفحہ ۲۲)

۱؎ یہ گفتگو جماعتِ خواتین میں کی گئی ہے۔ (پرویز)

پروفیسر رفیع اللہ شہاب
(میانوالی)

عربی کے بغیر اسلامیات کی تدریس

(مقالہ جو پہلی قومی کانگرس برائے فروغِ عربی، کراچی۔ منعقدہ اپریل ۱۹۷۵ء میں پڑھا گیا۔)

فروغ عربی کی پہلی قومی کانگرس کے کراچی انعقاد پر بندہ اہلِ کراچی کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔ اہلِ کراچی کو عربی زبان سے جو محبت ہے اس کی بنا پر میرا یہ اندازہ ہی نہیں بلکہ یقین تھا کہ اگر ہمارے ملک میں کبھی اس قسم کی کوئی قومی سطح پر کانگرس ہوگی تو اس کا شرف کراچی ہی کو رہے گا۔ ایسے یقین کے لیے میرے سامنے اہلِ کراچی کی عربی سے محبت کی کئی درخشندہ مثالیں تھیں، جن میں سے ایک دو کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

آج سے بیس بائیس سال پہلے برصغیر ہندو پاک کے علوم مشرقیہ کے سب سے قدیم ادارے، یعنی اورنٹیل کالج لاہور کا وجود خطرے میں پڑنے لگا، تو یہ کراچی کے دو مخیر حضرات تھے جنہوں نے اس کے بچانے کے لیے پانچ لاکھ روپے کا مشروط چیک پیش کیا۔ شرط صرف یہ تھی کہ کالج میں عربی زبان کی خصوصی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ اس واقعہ کی پوری تفصیلات کراچی ہی کے ایک مشہور ہفت روزہ "پیمان" کی ۱۹ اپریل ۱۹۷۳ء کی اشاعت میں شائع ہو چکی ہیں اور بہت سے اہلِ علم کی نظروں سے گزر چکی ہوں گی۔ اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی ذہن میں رکھئے کہ اسی لاہور میں ایسے لوگوں کی ایک کثیر تعداد موجود تھی جو اسلام اور اسلامی علوم کے بارے میں بڑے بڑے دعوے کرتے تھے لیکن انہوں نے اورنٹیل کالج کے خاتمے کی اس سازش کے خلاف احتجاج کا ایک لفظ تک نہ کہا۔

دوسرا واقعہ جس کا میں ذکر کروں گا وہ میرے ذاتی تجربہ پر مشتمل ہے۔ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد کے ایک سابق ڈائریکٹر ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب نے مجھے اپنے ادارے کا اعزازی ریسرچ فیلو مقرر کر کے اسلامی ریاست کے مالیاتی نظام پر ایک تحقیقی کتاب لکھنے کی دعوت دی۔ لیکن ابھی میں نے کام کی ابتداء ہی کی تھی کہ خود ڈاکٹر صاحب مذکور کو بعض وجوہات کی بنا پر ملک چھوڑنا پڑا۔ ان کے چلے جانے کے بعد اسلامی علوم کے بہت سے علمبرداروں نے مجھے گھورنا شروع کیا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا کام کی تکمیل کی شاید نوبت ہی نہ آتی۔ کراچی کے ایک اہلِ علم جناب خالد اسحاق صاحب ایڈووکیٹ کو جب صورتِ حال کا علم ہوا تو انہوں نے مجھے اپنے پاس بلا لیا اور ہر قسم کی سہولت مہیا کر کے کتاب مکمل کروائی۔ اہلِ کراچی کے لیے تشکر کے ان جذبات کے اظہار کے بعد میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔

پروفیسر میکناٹن ڈی انگریزی زبان کے ایک مشہور استاد ہو گزرے ہیں۔ انہوں نے اپنی تدریسی زندگی کا بیشتر حصہ برصغیر ہندو پاک میں گزارا تھا۔ ایک دفعہ مدراس کے ایک کالج میں جہاں وہ پرنسپل تھے انگریزی زبان کے ایم اے کے طلباء نے ان سے دریافت کیا کہ کیا وجہ ہے کہ دوسرے مضامین کی نسبت انگریزی مضمون پر دو تین گنا زیادہ محنت کرنے کے باوجود کوئی

امیدوار شاذ و نادر ہی اوّل درجہ (فسٹ ڈویژن) میں کامیاب ہوتا ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ انگریز پادریوں نے بائیبل مقدس اور اس کی اصطلاحات کو انگریزی زبان و ادب میں اس محنت اور مہارت سے سمو دیا ہے کہ وہ اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی ہیں اور جب تک انگریزی زبان و ادب کا کوئی طالب علم بائیبل مقدس کا گہری نظر سے مطالعہ نہیں کرے گا وہ انگریزی زبان اور اس کی مروجہ اصطلاحات پر کماحقہٗ عبور حاصل نہیں کر سکتا اور جس کے بغیر ایم اے انگلش میں فسٹ ڈویژن کا خواب تک نہیں دیکھا جا سکتا۔

یعنی ایک غیر ملکی زبان کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ان غیر ملکیوں کی مذہبی کتاب جو قرآن مجید سے کئی گنا ضخیم ہے کا مطالعہ ناگزیر ہے۔!

اس کے برعکس ہمارے علوم اسلامیہ کے اسکالروں کا کارنامہ ملاحظہ ہو کہ کسی زبان کو اس معیار تک پہنچانا کہ اس کے مطالعہ کے لیے قرآن حکیم کا مطالعہ ناگزیر ہو نا تو کجا انھوں نے خود علوم اسلامیہ کی اعلیٰ ترین تعلیم کو اس حد تک آسان کر دیا ہے کہ علوم اسلامیہ اور قرآن کی اصل زبان عربی کا ایک لفظ پڑھے بغیر اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگری حاصل کی جا سکتی ہے اس وقت ہمارے ہزاروں بھائیوں نے نہ صرف یہ کہ ایسی ڈگریاں حاصل کی ہوئی ہیں بلکہ اسلامیات کی تدریس بھی انھیں کے حوالے ہے۔

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ موجودہ حکومت نے ملکی دستور میں عربی زبان کے فروغ کی ضمانت دی ہے اور پھر اس کی روشنی میں بہت سے عملی اقدامات بھی کیے ہیں۔ مثلاً نیشنل سنٹروں کے ذریعے عربی زبان کی خصوصی کلاسیں جاری کی گئی ہیں۔ ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر عربی زبان سیکھنے کے سلسلے شروع کیے گئے لیکن جہاں تک تعلیمی اداروں میں عربی زبان کی زبوں حالی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسے جان بوجھ کر حکومت کی نظروں سے پوشیدہ رکھا گیا ہے۔ کیونکہ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے اس نے عربی زبان پر کسی قسم کے اخراجات سے بخل سے کام نہیں لیا اور اب بھی پاکستان کی تمام یونیورسٹیوں اور کالجوں میں عربی زبان کے شعبہ جات موجود ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے علوم اسلامیہ کے شعبوں میں کچھ ایسے اسکالر گھس گئے جنھیں عربی زبان پر کامل عبور نہ تھا اور انھوں نے اپنی کمزوری چھپانے کے لیے نصاب کی تیاری کے سلسلے میں کچھ ایسے اقدامات کیے کہ جن سے عربی زبان کے شعبوں میں طلبا کی تعداد محدود ہو کر رہ گئی اور سرکاری خزانے سے عربی کے فروغ پر ایک خطیر رقم خرچ کرنے کے باوجود نتائج بڑے حوصلہ شکن نکلے۔ اس لیے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس صورت حالات کو پوری تفصیل سے قوم کے سامنے رکھا جائے۔

قیامِ پاکستان کے بعد جب پہلے پہل پنجاب یونیورسٹی میں علوم اسلامیہ کا شعبہ کھولا گیا تو نخبہ یہ تھی کہ ایم اے اسلامیات میں ایک دو پرچے خالص عربی زبان کے لیے مخصوص کیے جائیں گے اور یہ کہ اس مضمون میں داخلہ لینے والوں کے لیے یہ شرط بھی ہوگی کہ انھوں نے بی اے تک عربی زبان پڑھی ہو۔ مقصد یہ تھا کہ اسلامیات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طالب علم اس مضمون کی اصل کتابیں جو عربی زبان میں ہیں سے استفادہ کے قابل ہوں۔ لیکن جب نصاب کی تفصیلات سامنے آئیں تو اس میں بی اے میں عربی پڑھنے کی شرط تو موجود تھی۔ لیکن ایم اے اسلامیات میں کوئی پرچہ عربی زبان کے لیے مخصوص نہ کیا گیا۔ حالانکہ ان دنوں فارسی زبان تک کے بعض امتحانات میں ایک پرچہ خالص عربی زبان کا تھا کہ اس سے فارسی زبان کو سمجھنے میں مدد ملتی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ عربی زبان کے ساتھ اس ناانصافی کے خلاف کسی نے معمولی سا احتجاج

بھی شروع کیا۔ صرف عربی سے محبت رکھنے والے چند نوجوانوں نے اسے محسوس کیا اور انہوں نے عربی کے فروغ کے لیے لجنۃ الارتقاء العربیہ کے نام سے ایک کمیٹی کی بنیاد رکھی۔

یہ سال ۱۹۵۴ء کے آخری تھے اور ان دنوں اس وقت کی دستوری سفارشات آخری مراحل میں تھیں۔ اس کمیٹی سے تعلق رکھنے والے زیادہ تر نوجوان مختلف تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے جو شام کے وقت مدرسۃ البنات ایک روڈ لاہور میں اکٹھے ہوتے تھے۔ آئندہ دستور کی اسلامی حیثیت اور ان نوجوانوں کی کوششوں سے بہت سے نوجوان وکلاء اور طلباء نے عربی سیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس مقصد کے لیے مدرسۃ البنات میں ہی شام کو ایسے شائقین کے لیے عربی کی تدریس کا انتظام کیا گیا اور پھر ان نوجوان قانون دانوں کا عربی زبان سیکھنے کا یہ شوق دیکھ کر یہ پروگرام بھی بنایا گیا کہ لجنۃ کا ایک وفد قانون کا نصاب بنانے والی کمیٹی سے رابطہ قائم کر کے یہ کوشش کرے کہ آئندہ قانون میں داخلہ لینے والے امیدواروں کے لیے بی اے میں عربی کی تعلیم لازمی قرار دی جائے۔ یعنی آئندہ قانون میں صرف ایسے طلباء کو داخلہ دیا جائے جنہوں نے بی اے تک عربی زبان کی تعلیم حاصل کی ہو۔ اور چونکہ اسلامی دستور بننے ہی والا ہے اس لیے قانون کے طلباء کو کم از کم اسلامی قانون کا پرچہ اس کی اصل زبان یعنی عربی زبان میں پڑھایا جا سکے۔ اسلامیات کا نصاب مرتب کرنے والوں سے مل کر یہ کوشش بھی کی گئی کہ جیسا کہ اسلامیات کا مضمون رائج کرتے وقت وعدہ کیا گیا تھا۔ اس کا بھی کم از کم ایک پرچہ خالص عربی زبان کے لیے مخصوص کیا جائے۔ ان حضرات نے ہماری گزارشات کو ہمدردی سے سنا اور ان سے اتفاق کرتے ہوئے ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا۔ لیکن اورنٹیل کالج لاہور کے پرنسپل نے سچی بات کہہ کر ہماری غلط فہمیوں کو دور کر دیا کہ آپ لوگ لا کالج میں عربی شامل کرانے کی فکر میں ہیں اور یہاں عربی زبان کے قدیم ادارہ یعنی اورنٹیل کالج کا وجود تک خطرے میں ہے۔ اللہ تعالےٰ کراچی کے دو مخیر حضرات کا بھلا کرے کہ انھوں نے عربی زبان سے محبت کی وجہ سے اس کالج کو بچانے کے لیے پانچ لاکھ کا چیک پیش کیا۔ ضمناً اس بارے میں ہمیں خود ڈاکٹر صاحب سے بھی گلہ تھا کہ انہوں نے عربی زبان کے شعبے کا علیحدہ صدر مقرر کرانے کی بجائے اسے بھی خود ہی سنبھال رکھا تھا۔

جیسا کہ ڈاکٹر صاحب کے اشارے سے معلوم ہو چکا تھا، ان نوجوانوں کی کوششوں کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ بلکہ اُلٹا اسے تعلیمی اداروں سے ختم کرنے کے کچھ مزید اقدامات کیے گئے۔ مثلاً اس سے پہلے ایم اے اسلامیات میں داخلہ کے لیے بی اے میں عربی کا مضمون لینا لازمی تھا۔ اب اس شرط کو بھی اُڑا دیا گیا اور بغیر عربی پڑھے اسلامیات میں اعلیٰ تعلیم دی جانے لگی۔ شعبۂ اسلامیات میں میرے ایک ہم جماعت استاد تھے۔ میں نے ان سے اس عجیب اقدام کی وجہ پوچھی تو ہنس کر بولے کہ عربی پڑھے ہوئے طالب علم عجیب عجیب سوالات کرتے ہیں۔ اس لیے ہم نے یہ کانٹا ہی نکال دیا ہے! اس شرط کے اٹھانے کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیمی اداروں میں عربی کے طلباء کی تعداد کم ہو گئی۔ جبکہ اسلامیات میں جس میں اب کسی قسم کی عربی زبان کی ضرورت نہیں تھی تعداد بڑھنی شروع ہو گئی۔ اب اُن دنوں مغربی پاکستان انتظامی طور پر ایک یونٹ تھا، اس لیے بیقین غالب ہے کہ ملک کی تمام یونیورسٹیوں میں عربی زبان کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہوا ہوگا۔

علماء حضرات سے یہ امید تھی کہ شاید وہ صورتِ حالات کے خلاف کوئی آواز اٹھائیں۔ لیکن ان حضرات میں سے اکثر کو نصاب تیار کرنے والی کمیٹیوں اور اس سلسلے کی دوسری تفصیلات کا پوری طرح علم نہ تھا۔ ہاں جماعتِ اسلامی میں

ایسے اہلِ علم کی اکثریت تھی جو نصاب کی تیاریوں کے مختلف نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف تھے اور جماعت کے بااثر ہونے کی وجہ سے ان حضرات کا احتجاج خاصا فائدہ مند ثابت ہو سکتا تھا۔ تاہم نصاب بنانے والی کمیٹیاں بھی اس حقیقت سے پوری طرح باخبر تھیں۔ اس لیے انہوں نے متوقع احتجاج کو پہلے ہی نظر میں رکھ کر کچھ بروقت اقدامات کر لیے تھے۔ یعنی ایم اے اسلامیات کے لیے عربی لازمی کی شرط اڑا لینے کے ساتھ ہی اسلامیات کے بی اے کے نصاب میں جماعت کے ایک مشہور اہلِ قلم کی کتاب "اسلامی نظریۂ حیات" شامل کر لی گئی۔ چنانچہ ان کا اندازہ صحیح نکلا اور کسی نے احتجاج کی تکلیف گوارا کرنا مناسب نہ سمجھا۔

مذکورہ بالا شرط کے اڑا دینے سے جب تعلیمی اداروں میں عربی زبان کے طلباء کی تعداد کم ہونے لگی تو ایک اور خطرناک فیصلہ کرا دیا گیا کہ جس مضمون میں طلباء کی تعداد بیس سے کم ہو اس کی تدریس ختم کر دی جائے۔ اس فیصلہ کا زیادہ تر اثر عربی زبان پر پڑتا تھا اور عربی کے اکثر اساتذہ فارغ ہوتے تھے اس لیے اس پر خوب واویلا مچا۔ چنانچہ بعد میں اس فیصلے میں عملاً یوں ترمیم کی گئی کہ جن تعلیمی اداروں میں عربی زبان کی تدریس ہو رہی ہے وہاں اسے کسی طور نہ چھیڑا جائے چاہے طلباء کی تعداد کتنی ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن نئے جاری ہونے والے تعلیمی اداروں میں سے بعض میں عربی کی تدریس کا انتظام نہ ہو سکا۔ چنانچہ اس مشکل کے حل کے لیے ایک اور قابلِ عمل تجویز پیش کی گئی جس پر عمل کرنے سے عربی زبان کے فروغ کے ساتھ ساتھ حکومت کے اخراجات میں بھی معتدبہ بچت ہو سکتی تھی۔ وہ تجویز یہ تھی کہ — انٹرمیڈیٹ کالجوں میں صرف دو جماعتیں ہوتی ہیں اور ہر مضمون کے استاد کو ہفتے میں بمشکل دس بارہ پیریڈ یعنی زیادہ سے زیادہ آٹھ گھنٹے پڑھانے ہوتے ہیں۔ تو دو دو ملتے جلتے مضامین کی تدریس ایک ہی استاد کے سپرد کر دی جائے، جیسا کہ اکثر پرائیویٹ کالجوں میں ہوتا رہا ہے۔ مثلاً ایک ہی استاد عربی اور اسلامیات پڑھائے۔ اسی طرح ایک ہی استاد فارسی اور اردو پڑھائے۔ بعض صوبوں میں اس تجویز پر عمل بھی کیا گیا۔ لیکن اس سلسلے میں ایک عملی مشکل یہ سامنے آئی کہ جہاں عربی کے تمام اساتذہ اسلامیات پڑھانے کے اہل تھے وہاں اسلامیات کے اساتذہ عربی زبان پڑھانے سے معذور تھے۔ اس لیے اس اسکیم کو پروان نہ چڑھنے دیا گیا۔

اس صورتِ حالات سے پریشان ہو کر یہ سارا معاملہ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کے اس وقت کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔ انہوں نے فرمایا کہ چونکہ نصاب کمیٹی پر ایسے لوگ چھائے ہوئے ہیں جو خود عربی زبان سے نابلد ہیں اس لیے ان سے کسی تبدیلی کی توقع رکھنا عبث ہے۔ تاہم وہ صدر ایوب (مرحوم) سے اس کا اس وقت ذکر کریں گے جب وہاں اسلامیات کے نصاب کے کرتا دھرتا جو پاکستان اسلامی مشاورتی کونسل کے بھی چیئرمین ہیں، موجود ہوں گے۔ چنانچہ انھوں نے موقع ملتے ہی حسبِ وعدہ ایسا ہی کیا۔ اس پر صدر ایوب مرحوم حیران ہو کر پوچھنے لگے کہ کیا عربی کے بغیر بھی اسلامیات کی تعلیم ممکن ہے تو متعلقہ صاحب نے فوراً وضاحت فرمائی کہ جناب پہلے طالب علم ایم اے عربی پاس کرتے ہیں اور بعد میں اسلامیات میں داخلہ لیتے ہیں۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ صدرِ مملکت کے سامنے اس حد تک کی غلط بیانی کی وجہ سے ان کے لیے خاموش ہونے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

میں ایک دفعہ پھر اپنی اس خوشی کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ موجودہ حکومت نے عربی زبان کے فروغ کے لیے بہت سے اقدامات کیے ہیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ملکی دستور میں اس کے فروغ کی ضمانت دی گئی

ہے۔ گھر بیٹھے عربی زبان سکھانے کے لیے ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے اسباق نشر ہو رہے ہیں۔ نیشنل سنٹروں میں ہنگامی بنیادوں پر اس کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ ان اقدامات پر حکومت کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اور پھر یہ سارے اقدامات ایسے ہیں جن پر حکومت کے زائد اخراجات اُٹھ رہے ہیں۔ تاہم ابھی تک تعلیمی اداروں میں عربی کو اس کا جائز مقام دلوانے کے لیے بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے اور ایسا کرنے کے لیے حکومت کو کسی قسم کے مزید اخراجات برداشت کرنے کی بجائے الٹا بچت کا امکان ہے۔ جیسا کہ انٹرمیڈیٹ کالجوں کے اساتذہ کے سلسلے میں ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔

آگے چلنے سے پہلے ہم ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ یہ کہ ہمارے استدلال سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اُردو زبان میں معیاری اسلامی لٹریچر کی کمی ہے۔ حاشا و کلا۔ اُردو زبان دینی علمی سرمائے سے مالا مال ہے، اور جہاں تک عمومی دینی تعلیمات کا تعلق ہے اس میں کافی لٹریچر موجود ہے۔ ہمارا استدلال صرف یہ ہے کہ اسلامیات کی اعلیٰ تعلیم کے لیے اس مضمون کی اصل زبان کو لازمی قرار دیا جائے۔ کیونکہ اس کے بغیر اس میں مہارت حاصل کرنا ممکن نہیں اور یہی بات اسلامی قانون کی تعلیم کے سلسلے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اُردو میں اکثر اسلامی لٹریچر مختلف مسلکوں بلکہ وقتی سیاست تک سے متاثر ہے اور ــــ اہل علم اس حقیقت سے بے خبر نہیں۔ عام کتابیں تو کجا بڑے بڑے تحقیقاتی کارناموں میں اس کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ عربی سے ترجمہ کی ہوئی کتابیں بھی اس سے محفوظ نہیں۔ یہاں میں صرف ایک مثال پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ یہ مثال ایک عربی کتاب "کتاب الخراج" کا اُردو ترجمہ ہے۔ ترجمہ اتنا عمدہ ہے کہ اس سے بہتر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اور یہ کارنامہ سرانجام دینے والے بھی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب ہیں۔ لیکن اتنا معیاری ترجمہ بھی وقتی سیاست سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مثلاً عشور یعنی کسٹم کے بارے میں اصل کتاب کے مصنف حضرت امام ابو یوسف کا مسلک یہ ہے کہ وہ مقررہ حد سے زیادہ بھی لیا جا سکتا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں۔ "ویوخذ باکثر ما یجب علیھم" (کتاب الخراج۔ مطبوعہ مصر صفحہ ۱۳۴) لیکن ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کے اس کتاب کے اعلیٰ ترین ترجمے میں جو اسلام کے نظام محاصل کے نام سے شائع ہو چکا ہے ان الفاظ کا ترجمہ غائب ہے۔ اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ جن دنوں کتاب طباعت کے مراحل میں تھی انہی دنوں زکوٰۃ کی شرح کے اضافے کے بارے میں بحث چھڑی ہوئی تھی۔ چونکہ فقہائے اسلام کے عشور کو زکوٰۃ ہی شمار کرتے ہیں اس لیے امام صاحب کے اس فتوے کی روشنی میں زکوٰۃ کی شرح کے اضافے کے بارے میں استدلال کیا جا سکتا تھا جو شائد مترجم یا ناشر کے مسلک کے خلاف تھا۔ اس لیے اس عبارت کا ترجمہ غائب کر دیا گیا۔

اسی طرح کی بہت سی مثالیں دوسری معیاری کتابوں کے بارے میں بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن چونکہ یہ ایک ناخوشگوار حقیقت ہے اس لیے ہم اس کی مزید تفصیل میں نہیں جاتے۔ اور اپنے موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔

ہماری گذارشات کا ملخص یہ ہے کہ حکومت نے عربی زبان کو فروغ دینے کے لیے ملکی دستور میں ضمانت دے رکھی ہے اور اس کی روشنی میں بہت سے عملی اقدامات کیے جا چکے ہیں۔ تقریباً عام تعلیمی اداروں میں عربی شعبوں کی موجودگی سے شاید حکومت مطمئن ہو کہ واں عربی زبان کے فروغ کا کام عرش اسلامی سے سرانجام پا رہا ہوگا۔ لیکن عملاً ایسا نہیں ہو رہا ــــ بے شک تعلیمی اداروں میں عربی کے اساتذہ موجود ہیں اور سرکاری خزانے سے پوری تنخواہیں وصول کر رہے ہیں۔ لیکن اُن کی

خدمات سے پورا پورا فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا۔ کیونکہ مختلف وجوہات کی بنا پر جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ ان کے شعبوں میں خطرناک حد تک طالب علموں کی کمی پیدا ہو چکی ہے۔ اور بڑے دکھ کی بات ہے کہ یہ کمی اس وقت پیدا ہوئی جب ہمیں عربی زبان میں زیادہ سے زیادہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ یہ ضرورت عرب ممالک سے تعلقات بڑھانے کا ایک منطقی نتیجہ ہے۔ عرب ممالک کے حالات سے دلچسپی رکھنے والے اہل علم اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر ہیں کہ عرب ممالک کے اسلامی ہونے کے ناطے سے وہاں ہندوستان جیسے مسلمان دشمن ملک کے لیے کام کرنے کی مطلق کوئی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن اس سنگین رکاوٹ کے باوجود ہندوستان نے محض اپنے عربی دانوں کی مدد سے سفارتی سطح پر بھی اور غیر سفارتی سطح پر بھی اپنے لیے ایک خاص مقام بنا لیا ہے۔

اس کے مقابلے میں اسلام کے رشتے کی وجہ سے ہمارے لیے عرب ممالک میں کام کرنے کے لیے انتہا مواقع موجود تھے، لیکن سفارتی سطح پر بھی ہمارے ہاں عربی دانوں کی کمی رہی ہے اور غیر سفارتی سطح پر تو شاید ایک بھی عربی دان حکومت کے لیے عرب ممالک میں کام نہیں کر رہا، جبکہ صرف ایک مصر میں ہندوستان کے پورے انتیس عربی دان اپنے ملک کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ان میں سے اب تین کو جمہوریہ لیبیا منتقل کیا جا چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ابھی تک اپنے عرب بھائیوں کو ہندوؤں کے خطرناک عزائم تک سے روشناس نہیں کرا سکتے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لیے ہمیں بہت سے اعلیٰ عربی دانوں کی ضرورت ہے جس کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایسے اقدامات کیے جائیں جن سے تعلیمی اداروں میں عربی پڑھنے والے طلباء کی تعداد میں اضافہ کیا جا سکے۔ اس سلسلے میں تجاویز پیش کرنے سے پہلے ایک اور اہم واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہوں جس سے ملک میں اعلیٰ عربی دانوں کی کمی کا سخت احساس ہوتا ہے۔

پچھلے سال فروری میں لاہور میں جو اسلامی سربراہی کانفرنس ہوئی وہ موجودہ حکومت کا ایک نہایت شاندار کارنامہ ہے۔ تاہم حکومت کے کچھ مخالفوں نے مختلف طریقوں سے اس بارے میں کچھ غلط فہمیاں پھیلانے کی کوشش کی۔ مثلاً جب اس کانفرنس کے کامیابی سے ختم ہو جانے کے بعد وزیر اعظم پاکستان نے ۲۳ مارچ ۷۴ء کے ایک انٹرویو میں تیسری دنیا کے حوالے سے اسلامی سربراہی کانفرنس کا ذکر کیا تو انھوں نے ایک مشہور کالم نویس نے روزنامہ نوائے وقت لاہور کی ۲۸ مارچ ۷۴ء کی اشاعت میں ایک لمبا چوڑا مقالہ شائع کیا کہ اسلامی سربراہی کانفرنس کا تیسری دنیا سے ناطہ جوڑنا دراصل اسلامی اتحاد کو کمزور کرنے کی سازش ہے۔ کیونکہ لیبیا کے صدر کرنل قذافی تیسری دنیا کے نظریے کو اسلام کے خلاف قرار دیتے ہیں۔

اتفاق سے کانفرنس کے دنوں میں راقم کو کرنل قذافی کا ایک کتابچہ مل گیا جس کا عنوان ہی "اسس الفطریہ العالمیہ الثالثہ" تھا۔ یعنی تیسری دنیا کے نظریہ کی بنیادیں ـــــ اور یہ کرنل قذافی کی اس تقریر پر مشتمل جو انھوں نے اپنے ملک میں اسی موضوع پر ہونے والی ایک کانفرنس کے سامنے کی تھی۔ اس کانفرنس میں پاکستان سے بھی ایک آٹھ رکنی وفد شامل ہوا تھا لیکن کسی نے مذکورہ بالا کالم نویس کی تردید نہ کی اور چونکہ راقم مذکورہ بالا کتابچے کا تعارف کرا چکا تھا اس لیے بار بار مجھ سے مذکورہ بالا اعتراضات کا جواب دینے کی درخواست کی گئی چنانچہ میں نے روزنامہ مساوات لاہور کی ۲۶ اپریل کی اشاعت میں ان اعتراضات کا اصل عربی عبارتوں سے جواب دے کر کالم نویس صاحب کو خاموش کر دیا۔ اب اگر لیبیا جانے والے مذکورہ بالا وفد میں کوئی اچھا عربی دان ہوتا اور وہ وطن واپس لوٹتے ہی

کرنل قذافی کے اس محبوب نظریئے کا تعارف کرا دیتا تو پھر کسی کالم نویس کو خواہ مخواہ وزیرِ اعظم پاکستان پر کیچڑ اچھالنے کا موقع ہی نہ ملتا۔

ان تفصیلات کی روشنی میں اس امر کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ تعلیمی اداروں میں عربی پڑھنے والے طلباء کی تعداد میں کافی اضافہ ہو کیونکہ انہی اداروں کے فارغ التحصیل طلباء حکومت کے مختلف محکموں کی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ ہمارے خیال کے مطابق مندرجہ ذیل اقدامات سے یہ مقاصد حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

۱۔ سب سے پہلے ایم اے اسلامیات میں داخلہ کے لیے بی اے میں لازمی عربی والی پرانی شرط کو فوری طور پر بحال کیا جائے اور اس کے بعد حسبِ معمول ایم اے اسلامیات کا ایک پرچہ خالص عربی زبان کے لیے مخصوص کیا جائے جیسا کہ اس مضمون کے شروع کرتے وقت وعدہ کیا گیا تھا۔

۲۔ قانون میں داخلے کے لیے کم از کم بی اے تک عربی لازمی قرار دی جائے اور پھر اس کے منطقی نتیجے کے طور پر قانون کے نصاب میں اسلامی قانون کو اس کی اصل زبان یعنی عربی میں پڑھانے کا انتظام کیا جائے۔

۳۔ انٹرمیڈیٹ کالجوں میں عربی طلباء کی تعداد کی کمی کی وجہ سے اسے ختم کرنے کی بجائے عربی اور اسلامیات کی تدریس ایک ہی استاد کے حوالے کی جائے۔ اس وقت ہمارے ہاں ایسے اساتذہ کی کمی نہیں جن کے پاس دونوں مضامین کی اعلیٰ اسناد ہیں۔ اسے نظیر بناتے ہوئے دوسرے بہت سے ملتے جلتے مضامین میں بھی یہ طریقہ کار اختیار کیا جا سکتا ہے جو عملاً پرائیویٹ کالجوں میں مروج رہا ہے۔ اس پر عمل کرنے سے حکومت کو لاکھوں روپے کی بچت ہو گی۔

۴۔ مندرجہ بالا طریقے سے بچنے والی رقم کا ایک معمولی حصہ اس طرح خرچ کیا جائے کہ عربی کا مضمون لینے والے طلباء سے کسی قسم کی فیس نہ لی جائے۔

۵۔ عرب ممالک میں سفارتی سطح پر ملازمتوں یا دوسرے وفود بھیجتے وقت عربی دانوں کی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ نوجوانوں میں اس مضمون کے لیے کشش پیدا ہو۔

مجھے امید ہے کہ ان سادہ اقدامات کہ جن پر حکومت کا ایک پیسہ بھی مزید خرچ نہ ہو گا، بلکہ بچت کا امکان ہے۔ تعلیمی اداروں میں عربی لینے والے طالب علموں کی تعداد میں کافی اضافہ ہو جائے گا جو انشاء اللہ تعالیٰ ہمارے لیے نہ صرف دینی طور پر بلکہ معاشی اور سیاسی طور پر بھی کئی فوائد کا حامل ہو گا۔ ان گزارشات کے ساتھ ہی میں اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں۔ دیگر تجاویز میرے دوسرے رفقاء پیش کریں گے۔ والسلام

بقیہ: اب بھائی آگے بڑھئے ۔۔ کی اکملیت اور ابدیت کے متعلق اس قدر شرح و بسط سے لکھا ہے کہ جو حضرات میری فکر کا مطالعہ کرتے چلے آ رہے ہیں ان کے نزدیک اس باب میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہی۔ انہیں حالات مجھے اس کی قطعاً ضرورت نہیں کہ میں بہائیت وغیرہ کے ساتھ مناظروں میں اپنا قیمتی وقت ضائع کروں۔ میں (زندگی کے ان آخری مراحل میں) وہی وقت، مثبت طور پر قرآنی تعلیم کے پیش کرنے کے لیے ہی کیوں نہ وقف رکھوں، اور یوں شکرِ نعمت ادا کروں۔

کاٹیج انڈسٹریز

حکومت پاکستان کے منظور شدہ
برآمد کنندگان
پوسٹ بکس ۴۰۲ راولپنڈی

کروشیا وغیرہ کا کام کرنے والی خواتین کے لیے
بہترین موقع

مندرجہ ذیل مراکز سے رجوع فرمائیں:

۱۔ مزمل انڈسٹریل ہوم ۔ گلی ۴ محلہ فیروز پورہ ۔ راولپنڈی
۲۔ منور ویلا ۔ لیہ (ضلع مظفر گڑھ) ضلع مظفر گڑھ میں برآمد (EXPORT) کا واحد ادارہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ
إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۝ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ
جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

O ye who believe! Fear God as He should be feared, and die not except in a state of Islam. And hold fast, all together, by the Rope which God stretches out for you, and be not divided among yourselves.

PREMIER TOBACCO INDUSTRIES LIMITED

علامہ اقبالؒ ـــــ اور ـــــ مولانا حسین احمد مدنیؒ

(معرکۂ دین و وطن)

تحریک پاکستان کے دوران جو تصادمات رونما ہوئے ان میں سب سے اہم وہ واقعہ ہے جسے خود علامہ اقبالؒ نے "معرکۂ دین و وطن" کہہ کر پکارا تھا۔ مختصراً یہ کہ مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) نے جو علمبرداران متحدہ قومیت کے سرخیل اور تحریک پاکستان کے مخالف علماء میں (یوں کہئے کہ) سرفہرست تھے۔ اپنی ایک تقریر میں کہا کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں"۔ چونکہ یہ نظریہ اسلام کے معیار قومیت کے خلاف، کھلا ہوا چیلنج تھا اس لیے علامہ اقبالؒ تڑپ اٹھے اور بے ساختہ وہ تین شعر کہے جو ہماری تاریخ میں ضرب المثل بن چکے ہیں۔ اس پر مولانا مدنی (مرحوم) نے ایک لمبا چوڑا بیان شائع فرما دیا۔ علامہ اقبالؒ نے اس کا جو جواب دیا وہ ہماری سیاسی (اور دینی) تاریخ میں روشنی کے مینار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس پر مولانا مدنی (مرحوم) نے کہا کہ میرا مقصد صرف یہ کہنا تھا کہ آجکل یورپ میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ یہ کہنا مقصود نہیں تھا کہ مسلمان بھی ایسا ہی کریں۔ علامہ اقبالؒ اس پر مطمئن ہو گئے اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ لیکن علامہ موصوف کی وفات کے قریباً چھ ماہ بعد مولانا مدنی (مرحوم) نے ایک ضخیم پمفلٹ شائع کر دیا جس میں کہا کہ اقبالؒ نے غلط کہا تھا۔ اسلام کی رو سے صحیح پوزیشن وہی ہے جسے میں نے اپنی تقریر میں پیش کیا تھا۔ چونکہ اس وقت حضرت علامہؒ دنیا میں موجود نہیں تھے۔ اس پمفلٹ کا جواب طلوع اسلام کی طرف سے شائع ہوا اور اس کی اشاعت بابت جنوری ۱۹۳۹ء میں چھپا۔ (اور پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع ہوا) مولانا مدنی (مرحوم) یا ان کے متبعین میں سے کسی کی جانب سے اس کا جواب شائع نہ ہوا۔

۲- اب صورت یہ ہے کہ تحریک پاکستان کے سلسلہ میں جب بھی علامہ اقبالؒ اور مولانا مدنی (مرحوم) کی اس آویزش کا ذکر آتا ہے تو مولانا مرحوم کے متبعین شور مچانا شروع کر دیتے ہیں کہ جب خود علامہ اقبال، مولانا مدنی (مرحوم) کے تشریحی بیان سے مطمئن ہو گئے تھے تو اس قصہ کو کیوں بار بار چھیڑا جاتا ہے۔ یعنی یہ حضرات اس قصہ کو مولانا مدنی کے اس بیان پر ختم کرا دیتے ہیں جو انھوں نے علامہ اقبال کی زندگی میں دیا تھا لیکن اس پمفلٹ کا قطعاً ذکر نہیں کرتے جو انھوں نے علامہ مرحوم کی وفات کے بعد شائع کیا تھا اور جس میں حضرت علامہ کے پیش کردہ مسلک کی تردید کی تھی۔ طلوع اسلام نے اپنی اشاعت بابت اپریل ۱۹۷۴ء میں ان حضرات کی اس ابلہ فریبی پر مختصر سا مقالہ بھی شائع کیا تھا۔

۳- پاکستان میں اب پھر اس تصور کو ہوا دی جا رہی ہے کہ مطالبہ پاکستان کی بنیاد کوئی دینی تقاضا نہیں

تھا، نہ ہی نظریۂ وطنیت (متحدہ قومیت) اسلام کے خلاف ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا مدنی وغیرہ کا نام نظریۂ وطنیت کے مؤیدین کے طور پر پیش کر کے کہا جاتا ہے کہ اگر یہ نظریۂ دین کے خلاف ہوتا تو وہ اس کے داعی کیسے ہو جاتے۔ اس پر ہمیں قارئین طلوعِ اسلام کی طرف سے مسلسل تقاضے موصول ہو رہے ہیں کہ طلوعِ اسلام نے ۱۹۳۹ء میں مولانا مدنی مرحوم کے پمفلٹ کے جواب میں جو مقالہ شائع کیا تھا اسے ازسرِ نو طلوعِ اسلام میں شائع کیا جائے تاکہ اس سے اس اہم مسئلہ (بلکہ اسلام کے ایک مسلّمہ) کی صحیح پوزیشن سامنے آجائے۔ ان تقاضوں اور مسئلہ کی اہمیت کے پیشِ نظر اس مقالہ کو یہاں شائع کیا جاتا ہے۔ علامہ اقبال کا بیان (معرکۂ دین و وطن) اس سے پہلے طلوعِ اسلام میں شائع ہو چکا ہے۔

۳۔ واضح رہے کہ اس مقالہ کی اشاعت سے ہمارا مقصد "گڑھے مردے اکھاڑنا" نہیں۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ:۔

۱۔ ہماری نئی نسل جو تحریکِ پاکستان کی تحریک سے قطعاً ناواقف ہے کے سامنے یہ حقیقت آجائے کہ اس وقت کس کس کے مسائل و نظریات میں ٹکراؤ ہو رہا تھا۔ علامہ اقبال اور قائدِ اعظم (بالفاظِ دیگر تحریکِ پاکستان) کا موقف کیا تھا اور اسلام کا نام لے کر اس کی مخالفت میں کیا کیا دلائل دیئے جاتے تھے۔

۲۔ اس زمانے میں عام سیاسی لہروں کا رُخ کس طرف کو تھا اور وہ قوم کی کشتی کو کس ساحل کی طرف بہا لے جانے میں مصروف تلاطم تھیں اور علامہ اقبال اور قائدِ اعظم اسے کس طرف لانا چاہتے تھے۔

۳۔ ہندؤں کی ہمنوائی میں ہمارے علمائے کرام اس باب میں کیا کردار ادا کر رہے تھے اور اگر وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جاتے تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا۔

۴۔ طلوعِ اسلام اس سلسلہ میں کیا خدمات سرانجام دیتا تھا اور اس کے اس زمانے کے فائلوں میں تحریکِ پاکستان کی تاریخ کس طرح لپٹے ہوئے اوراق کی شکل میں محفوظ ہے۔ نیز یہ کہ طلوعِ اسلام اس زمانے (قریب پینتیس (۳۵) سال پہلے) سے آج تک کس طرح ایک ہی مسلک کا داعی اور ایک ہی مشرب کا پیامبر چلا آرہا ہے اور حوادثِ زمانہ کا کوئی جھکڑ یا مفاد و مصالح کا کوئی مقناطیس اس کے نصب العین میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکا۔ یہ سب توفیقِ ایزدی کا تصدق ہے جو ہمیں اس کی کتابِ عظیم کے ساتھ تمسک سے حاصل ہوئی ہے اور جس کے لیے ہم اس کی درگاہ میں قدم قدم پر سجدہ ریز ہیں۔

۵۔ مقالہ بجنسہٖ شائع کیا جا رہا ہے۔ (بجز ایک آدھ مقام کے جسے بغرضِ اختصار اس لئے حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ اس کا تعلق براہِ راست نکتۂ زیرِ نظر سے نہیں تھا۔)

اب آپ وہ مقالہ ملاحظہ فرمایئے جو طلوعِ اسلام بابت جنوری ۱۹۳۹ء میں بعنوان "متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد صاحب" شائع ہوا تھا۔

ہندوستان کی سیاستِ حاضرہ میں، جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ نظریۂ قومیت ہے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں پہنچ کر ملتِ اسلامیہ کے افراد ایک دوسرے کو ھٰذا فراقُ بینی

بَلْکہ ٹُکڑے ٹکڑے کر کے الگ الگ جماعتوں میں تقسیم ہو رہے ہیں اور پھر یوں ایک دوسرے سے منہ موڑتے ہیں گویا ان میں کبھی کوئی چیز وجۂ جامعیت تھی ہی نہیں۔ یہی وہ بدبخت چٹان ہے جس سے ٹکرا کر اُمّتِ مسلمہ کی کشتی پاش پاش ہو چکی ہے اور اس کے منتشر تختے مختلف موجوں کے ساتھ اس طرح کسی کے عالم میں بہے جا رہے ہیں جیسے گنگا میں لاشیں تیرا ہی ہوں۔ قوم کی اجتماعیت فنا ہو چکی ہے۔ ان کی متعدد قوتیں باہمی تخریب و استہلاک میں صرف ہو رہی ہیں مسلمان کا گلا مسلمان کے ہاتھوں کٹ رہا ہے اور دوسری طرف وہ قوم جس نے اپنے استادانِ سیاست سے سیکھا ہے کہ کسی قوم کو تباہ و برباد کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ ان میں باہمی تفریق پیدا کر دو، نہایت اطمینان سے مسلمانوں کی طرف سے بالکل بے فکر ہو کر اپنی آنے والی حکومت کی تیاریوں میں مصروف ہے۔

سالِ گذشتہ کے آغاز میں اس نظریہ سے متعلق ایک نہایت اہم بحث کا سلسلہ چھڑا تھا۔ مولانا حسین احمد صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، نے اپنی ایک تقریر کے دوران فرمایا کہ "اس زمانہ میں قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں۔ مذہب سے نہیں بنتیں"۔ چونکہ یہ نظریہ اسلام کے شجرِ طیب کی جڑ پر تبر چلانے کے مترادف تھا اس لیے ملتِ اسلامیہ کے قلبِ حساس میں اس سے ایک ٹیس پیدا ہوئی اور آہ آتشیں کی شکل میں ان الفاظ میں لب تک آ پہنچی کہ ؎

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ ! زدیوبند حسین احمدؒ ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است ! چہ بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی است !
بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر باو نرسیدی تمام بو لہبی است ! (اقبالؒ)

ملت کا نصیبہ یاوری کرتا تو مولانا صاحب حضرت علامہ کے انہی اشارات سے متنبہ ہو جاتے اور اللہ تعالےٰ ان کو جرأت عطا کر دیتا تو وہ اپنی غلطی کا اعتراف بھی فرما لیتے کہ کونسا انسان ہے جسے معصوم عن الخطا ہونے کا دعویٰ ہو سکتا ہے۔ لیکن ہماری شورِیدہ بختی کہ ایسا نہ ہوا اور مولانا صاحب نے اعترافِ حقیقت کے بجائے "عذرِ گناہ" کا مسلک اختیار فرما لیا اور اپنے نظریہ کی تائید میں ایک مبسوط بیان شائع کر دیا۔ جس میں سب سے پہلے یہ فرمایا کہ "میں نے اپنی تقریر میں قوم کا لفظ استعمال کیا تھا اور حضرت علامہ نے اپنے شعر میں اسے لفظ ملّت سے تعبیر کیا ہے جو عربی میں قوم کے لیے نہیں، بلکہ دین اور شریعت کے لیے مستعمل ہے۔ اس لیے حضرت علامہؒ کا الزام غلط ہے"۔ اور اس کے اپنے نظریہ کی توضیح ان الفاظ میں فرمائی۔

(۱) موجودہ زمانہ میں قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں نہ کہ نسل و مذہب سے۔

(۲) قوم کا اطلاق ایسی جماعت پر کیا جاتا ہے جس میں کوئی وجۂ جامعیت ہو۔ خواہ وہ مذہب ہو یا وطنیت یا نسل یا پیشہ یا رنگت یا کوئی اور صفتِ معنوی یا مادی وغیرہ۔

(۳) یہ دعویٰ کہ اسلام کی تعلیم، قومیت کی بنیاد جغرافیائی حدود یا نسلی وحدت یا رنگ کی یکسانی کے بجائے شرفِ انسانی اور اخوتِ بشری پر رکھتی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ کونسی نصِ قطعی یا ظنی سے ثابت ہے۔

(مدینہ مورخہ ۲۱ فروری ۱۹۳۸ء)

جن خوش بخت حضرات کو حضرت علامہؒ کے قرب کی سعادت نصیب تھی ان کا بیان ہے کہ انھوں نے (حضرت علامہؒ

نے) جب اس بیان کو پڑھا تو وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے تھے اور کہتے تھے کہ یا الٰہ العالمین! اس ہندوستان میں تیرے اس پیغامِ ازلی کا کیا انجام ہونے والا ہے؛ جہاں کے مفتیانِ دینِ متین اور حامیانِ شرعِ مبین کی یہ کیفیت ہے کہ وہ اس نظریہ کو اسلامی نظریہ قرار دے رہے ہیں جس باطل نظریہ کو مٹانے کے لیے اسلام آیا تھا اور جب تک اسے عملاً فنا نہیں کر دیا گیا دین کی تکمیل اور اتمامِ نعمت کا اعلان نہیں ہوا۔ حضرت علامہؒ پر ان دنوں مرض الموت کے سخت دورے پڑ رہے تھے۔ لیکن مسئلہ کی اہمیت ایسی تھی کہ آپ نے جان تک کی پروا نہیں کی اور اس کے متعلق ایک نہایت بسیط اور جامع بیان اخبارات میں شائع فرما دیا اور یوں اس مسلسل جہاد کی تکمیل فرما دی جس کے اندر ان کی تمام زندگی صرف ہوئی تھی۔ یہ جواب اس قدر مسکت اور مستحکم تھا کہ مولانا صاحب کو کہنا پڑا کہ "میرا منشاء دہلی کے بیان میں اخبار تھا انشا نہ تھا۔" (متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ) یعنی یہ کہ میں نے صرف یہ بتایا تھا کہ آجکل یورپ کا نظریہ یہ ہے کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ مسلمانوں کو یہ مشورہ نہیں دیا تھا کہ تم بھی اپنی قومیت کی بنا جغرافیائی حدود قرار دے لو۔

اس کے بعد حضرت علامہؒ انتقال فرما گئے اور یوں اس بحث کا دروازہ بند ہو گیا۔ لیکن ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم نے دیکھا کہ حضرت علامہؒ کی وفات کے قریب چھ ماہ بعد مولانا صاحب نے مرحوم کے آخری بیان کی تردید میں ایک پمفلٹ بعنوان "متحدہ قومیت اور اسلام" شائع کر دیا جو اس وقت ہمارے زیر نظر ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ نفسِ موضوع کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ مولانا صاحب اس سے متعلق پمفلٹ نہیں بلکہ ایک ضخیم کتاب شائع فرما دیتے۔ لیکن ہمیں افسوس سے لکھنا پڑتا ہے کہ جس انداز سے یہ پمفلٹ لکھا گیا ہے وہ کچھ پسندیدہ نہیں۔ اس میں افہامِ حقیقت سے زیادہ زور حضرت علامہؒ کی تردید میں صرف کیا گیا ہے اور وہ بھی اس اسلوب سے کہ غم و غصہ کے انتقامی جذبات ایک ایک صفحہ سے اُبلتے نظر آ رہے ہیں جو اس بات کے غماز ہیں کہ اس تحریر کا محرک کونسا جذبہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایسے وقت میں جبکہ اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ فریقِ ثانی موجود ہی نہیں، جو کسی کے جی میں آئے کہہ ڈالے۔ اس سے کہنے والے کا کلیجہ تو ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ طرزِ عمل کس چیز کا آئینہ دار ہوتا ہے، اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ حضرت علامہؒ زندہ ہوتے تو ملتِ اسلامیہ کے سامنے اس پمفلٹ کے جواب کے ذریعے قرآنِ حکیم کے حقائق و معارف کا ایک اور باب کھل جاتا۔ اب ان کی جگہ لینے والا کون ہے۔ لیکن مولانا صاحب کو مطمئن رہنا چاہیے کہ ؎

اگرچہ میکدہ سے اُٹھ کے چل دیا ساقی! وہ مے، وہ خُم، وہ صراحی وہ جام باقی ہے

اور خمکدۂ اقبالؒ میں ایسے ایسے رندانِ قدح خوار موجود ہیں جو ساقی کی چشمِ مست کے صدقے شرابِ ہندی اور بادۂ حجازی میں ایک نگاہ میں تمیز کر کے بتا دیں۔ طلوعِ اسلام۔ جسے پیامِ اقبالؒ کی نشر و اشاعت کا فخر حاصل ہے اپنا فریضہ سمجھتا ہے کہ قرآن کریم کی روشنی میں متحدہ قومیت کے نظریہ کا تجزیہ کر کے مسلمانوں کے سامنے پیش کر دے تاکہ وہ سعید روحیں جو تلاشِ حقیقت میں مضطرب و بیتاب رہتی ہیں صحیح نتیجہ پر پہنچ کر سامانِ تسکین حاصل کر لیں۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ۔

طرزِ استدلال

آپ نے عام طور پر دیکھا ہوگا کہ ہمارے قومیت پرست حضرات اپنے دعاوی کی تائید میں ایک عجیب حربہ سے کام لیتے ہیں۔

جب کبھی ایسا ہو کہ وہ چاروں طرف سے گھر جائیں۔ کوئی راہ مفر نظر نہ آئے، جواب بن نہ پڑے، دلائل عاجز آجائیں تو اس دشمن ان کے ترکش کا آخری تیر نکلتا ہے اور وہ فریق مقابل سے نہایت جرأت و بے باکی سے کہہ دیتے ہیں کہ تم برطانیہ پرست ہو، سامراج کے حامی ہو۔ انگریز کے پٹھو ہو، رجعت پسند ہو، ٹوڈی ہو، آزادی کے دشمن ہو اور اس کا اس زور سے ڈھنڈورا پیٹتے ہیں کہ اصل موضوع اس شور میں گم ہو کے رہ جاتا ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ ان اوچھے ہتھیاروں پر عام سطح کے لوگ ہی اتر تے ہوں گے۔ لیکن ہمیں یہ دیکھ کر بے حد تاسف ہوا کہ مولانا صاحب نے بھی اس باب میں اسی حربہ سے کام لیا ہے۔ چنانچہ جن اخبارات نے ان کے پہلے بیان کی مخالفت کی تھی۔ ان کے متعلق ارشاد ہے۔

"اگرچہ بحیثیت واقعہ بہت سے اشخاص سے غلط فہمی کا ازالہ ہو چکا ہے اور ان برطانیہ پرست اخباروں کی افترا پردازی اور جھوٹے پروپیگنڈے کا پردہ اٹھ گیا ہے۔" (متحدہ قومیت اور اسلام ص۲)

ذرا آگے بڑھ کر تحریر فرماتے ہیں:۔

"برطانیہ کے ازلی وفاداروں کو کب ایسی بات کا تحمل ہو سکتا تھا۔" (ایضاً ص۳)

اپنے اس رسالہ کے متعلق یوں پیش بندی کرتے ہیں کہ:۔

"اگرچہ بہت سے ان لوگوں سے جن کو برطانیہ سے گہرا تعلق ہے یا جن کے دماغ اور قلب برطانی مدبرین کے سحر سے ماؤف ہو چکے ہیں۔ امید نہیں کہ وہ اس کو قبول کریں گے۔" (ایضاً ص۷)

جن حضرات کی نگاہیں نفسیات انسانی پر ہیں وہ خوب سمجھ سکتے ہیں کہ اس قسم کی پیش بندیوں کی ضرورت کب اور کیوں لاحق ہوا کرتی ہے۔ یہ ابتداء میں لکھا اور آخیر میں جا کر اسے پھر دہرا دیا کہ:۔

"جو لوگ مسلمانوں کو اس میدان سیاست میں آگے بڑھنے سے روک رہے ہیں اور متحدہ قومیت کو بھیانک صورت میں ظاہر کر کے نفرت دلا رہے ہیں، بلا شک و شبہ برطانیہ کی ایسی عظیم الشان خدمات انجام دے رہے ہیں جو اس کی افواج اور اسلحہ سے بھی انجام نہیں پا سکتیں۔" (متحدہ قومیت اور اسلام ص۴۷)

یہاں تک بھی خیر تھی۔ لیکن — درازدستی ہائے کوتہ آستینیاں ہیں — کہ وہ ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں اور سنیے اور داد دیجئے کہ — خود حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

"یہ امر یقینی اور غیر قابل انکار ہے کہ جناب ڈاکٹر صاحب کی ہستی کوئی معمولی ہستی نہ تھی اور ان کے کمالات بھی غیر معمولی تھے۔ وہ آسمان حکمت و فلسفہ، شعر و سخن، تحریر و تقریر، دل و دماغ اور دیگر کمالات علمیہ و عملیہ کے درخشندہ آفتاب تھے مگر باوجود کمالات گوناگوں ساحرین برطانیہ کے سحر میں مبتلا ہو جانا یا بعض غلطیوں میں پڑ جانا اور کسی ابجد خواں طالب علم کا اس سے محفوظ رہنا کوئی تعجب خیز بات نہیں۔" (ایضاً ص۸)

یہ مطلع تھا۔ مقطع ملاحظہ فرمائیے:۔

"غرضیکہ جادوگران برطانیہ نے اپنی ساحرانہ کارگزاریوں سے سرسید جیسے تجربہ کار عقلمند شخص کو نہ صرف متحدہ قومیت سے بلکہ پالٹیکس اور آئینی جدوجہد سے بھی روکا اور اسی کے ذریعہ سے مسلمانوں کو ہمیشہ سیاسیات سے علیحدہ رکھوا کر بالکل نابلد اور ٹوڈی لوگ بنا دیا۔ پھر اگر ڈاکٹر اقبال مرحوم اس سحر سے

مسحور ہیں تو کیا تعجب ہے" (ایضاً صفحہ ۱۷)

غالبؔ کو کسی مخالف نے ماں کی گالی دی تو اس نے کہا تھا کہ ان بدمذاق کور ذوق لوگوں کو گالی دینے کا سلیقہ بھی نہیں آتا۔ غالبؔ شاعر تھا اس لیے اس نے اس چیز کو کور ذوقی پر محمول کیا۔ لیکن اس کور ذوقی کا اگر نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب آدمی کے اعصاب پہ انتقامی جذبات کا بھوت سوار ہو جائے تو اس کا عقلی توازن قائم نہیں رہتا اور اس کے بعد اسے خود معلوم نہیں ہوتا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ ورنہ یہ ظاہر ہے کہ حضرت علامہؒ کے متعلق اور جو کچھ جی میں آئے کہہ لیجئے۔ شاید کوئی نہ کوئی ایسا مل جائے جو اسے باور کر لے۔ لیکن ان کے متعلق یہ کہنا کہ وہ سحرِ برطانیہ سے مسحور ہو چکے تھے ایک ایسا الزام ہے جسے تسلیم کرنے کے لیے کوئی صحیح الدماغ آدمی آپ کو نہیں ملے گا۔ اس لیے کہ جو شخص اقبالؒ سے تھوڑا بہت بھی واقف ہے وہ جانتا ہے کہ ان کی تو تمام زندگی سحرِ برطانیہ اور افسونِ افرنگ کے خلاف ایک مسلسل جہاد تھی اور ان کی زندگی کا یہ ایک ایسا کارنامہ تھا جس کا اعتراف خود ان کے مخالفین تک کو تھا۔ ان کے کلام پر اگر کوئی صاحبِ نظر دو لفظوں پر تبصرہ کرنا چاہے تو بلا تکلف کہہ سکتا ہے کہ وہ

فریاد ز افرنگ و دلآویزیٔ افرنگ

کی افسوں شکن تفسیر ہے، وہ اقبالؒ جس کی تمام عمر یہ کہتے کہتے گذر گئی کہ ؎

اے ز افسونِ فرنگی بے خبر فتنہ ہا در آستینِ او نگر
از فریبِ او اگر خواہی اماں اُشترانش را ز حوضِ خود براں

وہ جس نے "کفن دزدانِ یورپ" کی انسانیت سوز دسیسہ کاریوں کے خلاف ایک مسلسل صدائے احتجاج ان الفاظ میں بلند کی ہو کہ ؎

آدمیت زار نالید از فرنگ زندگی ہنگامہ برچید از فرنگ

وہ جو ان کے متعلق اس نتیجہ پر پہنچ چکا ہو کہ ؎

جبرئیل از صحبتش ابلیس گشت

اور اس لیے ایک صدائے ربانی بن کر آخری سانس تک یہی تلقین کرتا رہا ہو کہ ؎

مومن خود، کافر افرنگ شو[۱]

اس اقبالؒ کے متعلق یہ کہنا کہ وہ "ساحرینِ برطانیہ کے جادو سے مسحور ہو چکا تھا" یا تو بقول غالبؔ اپنی انتہائی بدمذاقی کا ثبوت دینا ہے یا مغلوب الغضب ہونے کا اعلان کرنا۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ آج ہندوستان کے مسلمانوں میں بالعموم اور اس کا طبقہ میں بالخصوص جو انگریزی خواں نہیں ہے۔ سحرِ یورپ کے خلاف جس قدر بغاوت اور تنافر کے جذبات پائے جاتے ہیں، یہ رہینِ منت ہیں۔ اسی مردِ حق آگاہؒ کی سعیِ پیہم کے۔ کس قدر ظلم ہے کہ بجائے اس کے کہ مولانا صاحب انگریزی نہ جاننے والے

۱۔ حضرت علامہ اقبالؒ کے کلام سے اس عنوان پر اگر تمام اشعار جمع کیے جائیں تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے۔ مثنوی "پس چہ باید کرد" کے مندرجہ صدر اشعار یونہی اس وقت ذہن میں آ گئے ہیں۔ استیعاباً اس پر کچھ لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ ہر وہ شخص جس نے کلامِ اقبالؒ کو سرسری نظر سے بھی دیکھا ہے اُسے معلوم ہے کہ طلسمِ فرنگ کی افسوں نے کس حد تک نقاب کشائی کی ہے۔

طبقہ کے نمائندہ کی حیثیت سے حضرت علامہؒ کے اس احسان کے لیے اظہارِ تشکر فرماتے۔ وہ ان کے خلاف اس حربہ کو لے کر میدان میں اتر آئے جس کی زد اچٹ کر خود اپنے ہی اوپر آ پڑی ہے کہ ؎

تا مرد سخن نگفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد

اگر حضرت علامہؒ کے خلاف عوام کو بھڑکانا ہی مقصود تھا تو اتنا کہہ دینا کافی تھا کہ ان کا فوٹو دیکھو تو داڑھی کہاں ہے؟[1] اور پھر آپ نے یہ بھی ملاحظہ فرمایا کہ یہ سحرِ برطانیہ کا فتنہ کیا کس موقع پر جا پہنچا ہے! مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ "آجکل قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں۔ مذہب سے نہیں بنتیں"۔ حضرت علامہؒ کا ارشاد ہے کہ یہ نظریہ کہ قومیت کی بناء وطنیت پر ہے، ساحرینِ یورپ کا پیدا کردہ ہے۔ اسلام مسلم قومیت کی بناء خالص ایمان پر رکھتا ہے۔ لہٰذا اسلام کا نظریۂ قومیت، یورپ کے نظریۂ قومیت کے بالکل خلاف ہے۔ اس کے جواب میں مولانا صاحب کا فتویٰ ہے کہ اقبالؒ ساحرینِ یورپ کے دامِ تزویر میں گرفتار تھا۔

یعنی

جو شخص یورپ کے ایجاد کردہ نظریہ کی تائید کرے وہ تو رئیس الاحرار ہے۔ اس پر سحرِ یورپ کا کوئی اثر نہیں،

اور

جو شخص اس کی مخالفت کرے اور یہ بتائے کہ یہ سحرِ یورپ ہے اس سے بچ کر رہنا۔ وہ ساحرینِ یورپ کے سحر میں گرفتار ہے۔

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

ان حضرات کے نزدیک سحرِ برطانیہ سے تو وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جو کفر و اسلام کے امتزاج سے ہندوستان میں ایک "متحدہ قومیت" کی تشکیل کی حمایت کرے، اپنی کوئی رائے نہ رکھے۔ بلکہ کانگریس کی پاس کردہ تجاویز کے لیے آلۂ مکبر الصوت (LOUD SPEAKER) کا کام دے۔ کانگریسی ائمہ سیاست کی اقتداء میں جو حیثیت امام کی سدمیری" کہ کر ان کی آواز پر اٹھتا اور جھکتا چلا جائے۔ ان کے فتاویٰ کے نیچے "الجواب صحیح" لکھ کر مہرِ تصدیق ثبت کر دے۔ اور جو ایسا نہ کرے اس کے متعلق اعلان کر دے کہ اسے انسان کہلانے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

وہی جذبۂ انانیت و خود پرستی جو کبھی اپنے آپ کو نحن ابناء اللّٰہ (اللہ کی چہیتی اولاد) اور دوسروں کو لیسوا علیٰ شیٔ (عقل و بصیرت سے عاری) سمجھنے پر آمادہ کرتا تھا، جو اس دعویٰ کا محرک ہوتا تھا کہ لن یدخل الجنۃ الا من کان ھودًا او نصاریٰ (جنت میں وہی جائے گا جو ہمارے مسلک کی تائید کرے گا۔) آج وہی جذبہ اپنے آپ کو رئیس الاحرار اور باقی مسلمانوں کو ذلیل و خوار غلام سمجھنے کا محرک بن رہا ہے۔ روح وہی کارفرما ہے جو اقوامِ سابقہ کے احبار و رہبان میں ہنگامہ خیز تھی۔ صرف قالب میں فرق ہے ؎

بدل کے بھیس زمانہ میں پھر سے آتے ہیں اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

(اقبالؒ)

تضاد بیانات:- جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ مولانا صاحب نے حضرت علامہؒ کی زندگی میں اپنی غلطی کو اس نقاب میں

[1] آگے چل کر مولانا صاحب نے ایسا بھی کہا ہے۔

چھپانے کی کوشش کی تھی کہ دہلی کی تقریر سے ان کا مطلب صرف اس قدر بیان کرنا تھا کہ آج کل یورپ میں قومیت کے متعلق اس قسم کا نظریہ قائم ہو چکا ہے۔ اس سے مقصود یہ مشورہ دینا نہیں تھا کہ مسلمان بھی اپنی قومیت کی تشکیل انہی خطوط پر کریں۔ اس کا اعتراف خود رسالہ زیر نظر میں بھی موجود ہے۔ جہاں فرماتے ہیں :-

"جس طرح ڈاکٹر صاحب مرحوم کو میرے بعض احباب کے خطوط کے جواب سے معلوم ہوا۔ دہلی کی تقریر میں مشورہ دینا نہ تھا اور نہ کوئی لفظ اس کا ذکر کیا گیا تھا۔" (متحدہ قومیت اور اسلام ص۳)

لیکن اب مولانا صاحب نہ صرف اس نظریہ کا مشورہ ہی دیتے ہیں بلکہ اسے قرآن کریم سے ثابت کر کے بطور مذہبی فریضہ کے پیش کرنے کی کوشش فرماتے ہیں اور (معاذ اللہ) اسے خود نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کر کے مسلمانوں کو اس اسوۂ حسنہ کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ ہندوستانیوں کے لیے اپنے ضائع شدہ حقوق حاصل کرنے کا تذکرہ کرنے کے بعد فرماتے ہیں :-

"ایسے مقاصد کے لیے متحدہ قومیت غیر مسلموں کے ساتھ بنانا خود جناب سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام سے منقول ہے۔" (ایضاً ص۳۲)

اور اس کی اس شدت سے تائید فرماتے ہیں کہ :-

"بنا بریں متحدہ قومیت کا جذبہ (جو کہ ان مختلف مذاہب ہندیہ میں بجز وطنیت اور کسی ذریعہ سے پیدا نہیں ہو سکتا) پیدا ہونا اور نہایت قوت کے ساتھ پیدا ہونا از بس ضروری ہے۔" (ایضاً ص۱۶)

معلوم نہیں کہ جس مسئلہ کو حضرت علامہؒ کی زندگی میں محض اخبار (خبر دینے) کی حیثیت سے پیش کیا گیا تھا اب کونسے مصالح سامنے آ گئے کہ اسے انشا کی حیثیت دی جا رہی ہے اور مسلمانوں کے دین اور دنیا کا تحفظ اسی کے اندر بتایا جا رہا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ سیاسی معاملات میں عوام کا حافظہ کمزور ہوا کرتا ہے۔ لیکن اتنا بھی کمزور نہیں جتنا مولانا صاحب خیال فرما رہے ہیں۔

لغوی بحث

مولانا صاحب نے فروری ۱۹۳۸ء میں جو بیان شائع فرمایا تھا اس میں تمام قوت اس بات کے ثابت کر دینے میں صرف فرما دی تھی کہ میں نے "قوم" کا لفظ استعمال کیا تھا اور حضرت علامہؒ نے اپنے شعر میں لفظ "ملت" لکھا ہے جو قوم کے لفظ سے بالکل جداگانہ مفہوم پر دلالت کرتا ہے۔ ہم نے اپنے مضمون (نظریۂ قومیت مطبوعہ طلوع اسلام بابت مئی ۱۹۳۸ء) میں عرض کیا تھا کہ ایک ایسے اہم مسئلہ کو لغوی بحث کے لفظی گورکھ دھندوں میں الجھا کر یہ سمجھ لینا کہ ہم نے اپنے دعوے کو نہایت محکم دلائل سے ثابت کر دیا ہے، اپنے آپ کو دھوکہ دینا اور قوم پر ظلم کرنا ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ متحدہ قومیت کا تصور از روئے اسلام جائز ہے یا نہیں؟ اس سوال کو اس بحث سے کیا تعلق کہ لفظ ملت بمعنی قوم استعمال ہوتا ہے یا نہیں؟ رسالہ زیر نظر جب ہمارے سامنے آیا تو چونکہ اس کا عنوان تھا "متحدہ قومیت اور اسلام" ہمیں خوشی ہوئی کہ مولانا صاحب جیسے عالم متبحر نے اب تو اسلامی نقطۂ نگاہ سے اس موضوع پر روشنی ڈالی ہوگی۔ لیکن ہماری مسرت بہت جلد مبدل بہ تاسف ہو گئی۔ جب ہم نے دیکھا کہ مولانا صاحب نے ایک نہیں دو نہیں، مسلسل ۲۱ یا بیس صفحات پھر اس تحقیق انیق کی نذر کر دیئے ہیں کہ قوم کے معنی ملت کے معنوں سے مختلف ہیں اور اس میں بھی بڑی بوجھل عربی لغت کی کتابوں مثلاً مختار الصحاح۔ قاموس۔ تاج العروس۔ مجمع البحار۔ المنجد وغیرہ۔

کے حوالوں سے اپنے دعوے کی تائید فرمائی ہے۔ ہم تو اس چیز کو سمجھ ہی نہیں سکے کہ نفسِ موضوع کو بالآخر اس لغوی بحث سے تعلق کیا ہے۔ یا تو مولانا صاحب خود ہی یہ نہیں سمجھ سکے کہ مسئلہ متنازعہ فیہ ہے کیا۔ اور یا وہ دانستہ فریقِ مقابل کو دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے کے بوجھ سے دبانا چاہتے ہیں۔ اس اسلوبِ مباحثہ سے ہمیں ایک مناظرہ کا قصہ یاد آگیا۔ ایک مولوی صاحب تھے، فنِ مناظرہ میں طاق لیکن ویسے بالکل کورے۔ فریقِ مقابل ایک پڑھے لکھے فارغ التحصیل طالب علم تھے۔ اوّل الذکر مولوی صاحب کو فکر دامنگیر ہوئی کہ نفسِ مضمون پر بات چھڑ گئی تو پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے انھوں نے بساطِ مناظرہ پر شاطرانہ چال سے کام لینے کی ٹھانی۔ اُٹھ کر فرمایا کہ مولوی صاحب سب سے پہلے یہ فرمائیے کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کلمہ ہے یا نہیں۔ مولوی صاحب کے دماغ میں پوری صرف و نحو چکر لگا رہی تھی۔ وہ اس نحوی غلطی کے کس طرح مرتکب ہو سکتے تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ نہیں! یہ کلمہ کیسے ہو سکتا ہے۔ الکلمۃ لفظ مفرد (کلمہ لفظِ مفرد کو کہتے ہیں) مناظر مولوی صاحب نے بلند آواز سے کہا کہ لو بھائی مسلمانو! جو شخص مسلمانوں کے کلمہ کو کلمہ ہی نہیں مانتا اس سے ہماری بحث کیا ہو سکتی ہے۔ مسلمانوں کی باہمی بحث تو ان سے ہو سکتی ہے جن کا کلمہ ایک ہو۔ عوام کی جانے بلا کہ نحوی مولوی صاحب نے کیا کہا۔ انھوں نے اتنا ہی سمجھا کہ یہ تو واقعی کلمہ کا بھی قائل نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اس کے بعد کیا ہوا ہو گا۔

قوم و ملت کے لغوی گورکھ دھندے سے کچھ اسی نہج کی بحث مولانا صاحب چھیڑ دیتے ہیں اور آپ یہ سن کر انگشت بدنداں رہ جائیں گے کہ خود مولانا صاحب کو اس امر کا اعتراف ہے کہ حضرت علامہ نے ملت کا لفظ قوم ہی کے معنوں میں استعمال کیا تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

"مگر دوسری حیثیت سے کہ جناب ڈاکٹر صاحب مسلمانانِ ہند کو قومیت متحدہ کا مشورہ دینا خلافِ دیانت سمجھتے ہیں اور یہ امر میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔" (متحدہ قومیت اور اسلام ص۱۵)

اب آپ خود ہی اندازہ لگا لیجئے کہ مولانا صاحب کا اتنی طول طویل لغوی بحث سے مطلب کیا ہے۔ یہ تو رہا خود ان کا اعتراف۔ لیکن اگر بحث کا فیصلہ اس لغوی اعتبار سے ہی کرنا ہو تو وہ ایک فقرہ ہیں ہو سکتا ہے۔ بے شک عربی میں قوم کے معنی جماعت اور گروہ کے ہیں اور ملت کے معنی شرع و دین کے۔ لیکن حضرت علامہ نے اشعار مذکورہ صدر فارسی زبان میں لکھے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ فارسی میں ملت بمعنی جماعت اور گروہ کے آتا ہے یا نہیں؟ اس کے متعلق مولانا صاحب فرماتے ہیں۔

"اور اگر غور کیا جائے تو متاخرین عرب اور فارسیوں اور ترکوں نے بھی لفظ ملت کو قوم کے معنی میں کہیں بھی استعمال نہیں کیا۔" (متحدہ قومیت اور اسلام ص۱۵)

لیکن ہم نہایت ادب سے گزارش کریں گے کہ جہاں انھوں نے عربی کے اتنے اتنے ضخیم لغت کھنگالے تھے اگر فارسی کے ایک چھوٹے سے لغت، مثلاً غیاث اللغات کی ورق گردانی کی تکلیف گوارا فرما لیتے تو اس میں نہایت آسانی سے نظر آجاتا کہ ملت کے معنی جماعت اور گروہ کے بھی لکھے ہیں۔

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

پھر یہ چیز بھی غور طلب ہے کہ مولانا صاحب نے "متحدہ قومیت" کے معانی متعین کرنے کا جو طریق اختیار فرمایا ہے وہ اصولی طور پر غلط ہے۔ وہ پہلے لغت سے لفظ قوم کے معنی متعین فرماتے ہیں۔ یعنی گروہ، جماعت۔ اور پھر لفظ متحدہ کے یعنی جن میں باہمی اتحاد ہو اور اس کے بعد جھٹ سے اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ متحدہ قومیت کے معنی ہیں دو قوموں کا باہمی اتحاد کے رشتہ سے منسلک ہونا اور

اس کے بعد فتویٰ صادر فرما دیتے ہیں کہ کیجئے یہ کس طرح اسلام کے منافی ہے۔ یہ ہے لے دے کے خلاصہ ان کی تمام لغوی بحث متعلقہ "متحدہ قومیت اور اسلام" کا۔ اسی سے تو ہم سمجھتے ہیں کہ مولانا صاحب پر غالباً ابھی تک یہ بھی واضح نہیں ہوا کہ مسئلہ متنازعہ فیہ ہے کیا۔ یہ ظاہر ہے کہ "متحدہ قومیت" یا (NATIONALISM) دورِ حاضرہ کی ایک سیاسی اصطلاح ہے جس کے معنی دورِ حاضرہ کی سیاسی روشنی میں ہی متعین کیے جا سکتے ہیں نہ کہ اس زمانہ کے کتب لغت سے جن میں اس اصطلاح کا کہیں ذکر تک نہ ہو۔ اس طرح اصطلاحات کے معانی متعین کرنے سے تو اصل مطلب کبھی سامنے نہیں آ سکتا۔ دورِ حاضرہ کی مختلف سیاسی اصطلاحات کو لیجئے۔ مثلاً ترکِ موالات، عدم تشدد، مخلوط انتخاب۔ گول میز کانفرنس، بین الاقوامی وفاق (FEDERATION OF STATES) وغیرہ اور ان کے معانی پرانی کتب لغت سے متعین کیجئے۔ پھر دیکھئے اصل مطلب کس طرح خبط ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ مصطلحات مروجہ کے معانی ہمیشہ اُس زمانہ اور اس ماحول کے ماتحت لینے پڑیں گے جس میں کسی اصطلاح کا رواج ہوا ہو۔ لہٰذا جب ہم "متحدہ قومیت" کو اسلام کی میزان سے تولنا چاہیں گے تو پہلے یہ متعین کرنا ضروری ہوگا کہ متحدہ قومیت سے مراد کیا ہے۔ اس کے بعد دیکھیں گے کہ اسلام اس کے متعلق کیا کہتا ہے۔ یہ ہے صحیح طریقہ کسی واضح نتیجہ تک پہنچنے کا۔ آیئے پہلے متحدہ قومیت کے معانی متعین کر لیں۔

باب دوم

متحدہ قومیت کا مفہوم

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں متحدہ قومیت (NATIONALISM) دورِ حاضرہ کی ایک سیاسی اصطلاح ہے جو بالخصوص ہندوستان میں فرقہ واری (COMMUNALISM) کے مقابلہ میں رائج کی گئی ہے۔ اس اصطلاح کے معانی مرتب کرنے کے لیے ہمیں ان سیاسی مدبرین کی تحریروں اور تقریروں کی طرف رجوع کرنا ہوگا جنھوں نے اس اصطلاح کو رائج کیا ہے۔ مولانا صاحب نے خود فرمایا ہے کہ کانگرس نے اپنے پہلے اجلاس منعقدہ ۱۸۸۵ء میں اپنا پہلا اور ضروری مقصد حسبِ ذیل الفاظ میں ظاہر کیا تھا۔

"ہندوستان کی آبادی جن مختلف اور متصادم عناصر سے مرکب ہے۔ ان سب کو متحد و متفق کر کے ایک قوم بنانا۔" (متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ ۵۲)

لہٰذا متحدہ قومیت کے معنی کانگرسی حضرات کے ہاں سے ہمیں مل سکیں گے اور وہ بھی عصرِ حاضر کے کانگرسی حضرات سے کہ اس مسئلہ نے اتنی اہمیت حال ہی میں اختیار کی ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو لکھتے ہیں:

"ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت پیدا ہو۔" (جامعہ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

اس سے اتنا تو معلوم ہو گیا کہ جس متحدہ قومیت کا نقشہ کانگرس کے ذہن میں ہے وہ آج موجود نہیں ہے بلکہ وہ کوشش کرنے کے بعد پیدا ہوگی۔ آج مسلمان ایک الگ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہندو الگ۔ اس لیے یہ شکل متحدہ قومیت کی نہیں ہے۔ متحدہ قومیت کے عناصر ترکیبی کیا ہوں گے۔ اس کی تفصیل ذیل کی سطور میں ملے گی۔

عنصرِ اوّل۔ مہاتما گاندھی لکھتے ہیں:

"آج مسلمانوں کی الگ تہذیب ہے اور ہندوؤں کی الگ۔ ان دونوں تہذیبوں کے امتزاج سے متحدہ قومیت کی تہذیب مرتب ہوگی۔" (ہریجن مورخہ ۲۹ - بحوالہ اسٹیٹسمین)

اس کی تفسیر سوامی سمپورنانند۔ وزیر تعلیم۔ یو۔پی، ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

"ہر وہ شخص جو ہندو، یا مسلم تہذیب کے قائم رکھنے اور اس کو مدارس میں جاری کرنے پر زور دیتا ہے وہ یقینی طور پر ملک کو نقصان پہنچاتا ہے۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ چیز ہندوستان میں مفقود ہونی چاہیئے۔۔۔جب ہندو مسلم تہذیبیں مٹ جائیں گی تب ہی ہندوستانی تہذیب زندہ ہو سکے گی۔" (ٹریبون وردیہ)

کانگرس کے شعبۂ اسلامیات کے معتمد ڈاکٹر اشرف صاحب اس کی تشریح میں یوں رطب اللسان ہیں:-

"اسی اعتبار سے ہم آج ایک نئے اور زندہ تمدن کی تعمیر میں مصروف ہیں۔ ہماری سیاسی اور سماجی جدوجہد اس نئے تمدن کا پیش خیمہ ہے۔" (الجمعیۃ۔ رجب ۱۳۵۶ھ)

اس سے معلوم ہوا کہ متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوگا، ایسی تہذیب جو نہ مسلمانوں کی ہو۔ نہ ہندوؤں کی۔ بلکہ دونوں کے امتزاج سے ایک نئی تہذیب پیدا ہو۔

عنصر دوم

آج مسلمانوں کا مذہب الگ ہے اور ہندوؤں کا الگ، اس لیے متحدہ قومیت ابھی وجود میں نہیں آسکتی۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ دونوں مذاہب ملا کر ایک ایسا مذہب پیدا کیا جائے جو دونوں کا مشترکہ مذہب بن سکے۔ چنانچہ ڈاکٹر سید محمود صاحب وزیر تعلیم صوبہ بہار اپنے ایک مضمون میں اکبر کے دینِ الٰہی کی طرف اشارہ کر کے فرماتے ہیں:-

"بعض نے اپنے ولولہ اور جوش سے مجبور ہو کر ہندوستان میں متحدہ قومیت کی آفرینش کے پیشِ نظر ایک ایسے جدید مذہبی نظام کی نشوونما کرنی چاہی جو ہندوستان میں سب کے مناسب حال ہو۔ یہ ان لوگوں کی معمولی خدمات نہیں کہی جا سکتیں۔" (جامعہ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

آنریبل مسٹر کے ایم منشی۔ ہوم منسٹر حکومت بمبئی نے اپنی ایک تقریر کے دوران فرمایا:-

"جس قدر رجحانات مذہب یا زبان یا ایسے چھوٹے چھوٹے مسائل کی بناء پر قومیت پرستی کے خلاف پیدا ہوتے ہیں۔ کانگرس ان رجحانات کی مخالفت میں ایک مسلسل جدوجہد کا نام ہے۔ من حیث القوم ہماری کمزوری کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ بعض لوگوں کی طرف سے ایک واہمہ پیدا کر دیا گیا ہے کہ مذہب یا زبان کا رشتہ قومیت کے رشتہ کی جگہ وجۂ جامعیت ہو سکتا ہے۔ یہ ایک بڑا مہلک دھوکہ ہے۔ یاد رکھیئے مذہب یا زبان کا رشتہ ہمیشہ قومیت کے بلند ترین رشتہ کے ماتحت رہنا چاہیئے۔ یہ تصور ہی ہندوستان کو محکم اور آزاد بنا سکے گا۔" (نیشنل کال ۹/۳/۲۰)

ڈاکٹر پی۔ پٹابھی سیتارامیا۔ کانگریس کی مجلس عاملہ کے ایک رکن نے سودیشی نمائش پٹنہ کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا:-

"ہمارا معاشرتی نظام جو ہزاروں برس ہوئے وجود میں آیا تھا اس کی رو سے افلاس کا ناطہ علم اور عظمت کے ساتھ جوڑ دیا جاتا تھا۔ لیکن اب زندگی کی متضاد قوتوں میں توازن پیدا ہو چکا ہے۔ اشتراکیت (کمیونزم) اور اشتمالیت (سوشلزم) دورِ حاضرہ کے نظریۂ حیات ہیں اور ہندوازم اور اسلام ازم عہدِ کہن کی یادگاریں ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم ان کی بنیادوں کا از سر نو امتحان کریں۔" (ہندوستان ٹائمز ۹/۳/۱۹)

مذہب چونکہ متحدہ قومیت کی تشکیل و تعمیر میں ایک سنگِ راہ سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے ضروری سمجھا گیا ہے کہ جب تک ایک

متحدہ مذہب وجود میں نہ آئے۔ مذہب کو محض ایک پرائیویٹ عقیدہ کی حیثیت دی جائے اور اسے سیاست سے بالکل الگ رکھا جائے۔ چنانچہ کانگرس کے صدر مسٹر بوس نے آسام میں ایک تقریر کے دوران میں کہا تھا کہ "میں سب کچھ مسلمانوں کے حوالہ کر دینے کو تیار ہوں۔ بشرطیکہ وہ متحدہ قومیت کے نظریہ کو تسلیم کر لیں" اس کی وضاحت میں ٹریبون نے اپنے ۱۷ جون ۱۹۳۸ء کے پرچے کے افتتاحیہ میں لکھا:-

"بس اس ایک شرط کے ماتحت طول و عرض ملک میں کوئی ایک کانگرسی بھی ایسا نہ ہوگا جو تمام اختیارات مسلمانوں کے حوالہ کر دینے پر آمادہ نہ ہو۔ ان کے (یعنی کانگرسیوں کے) نزدیک یہ مسئلہ ذرا بھی اہمیت نہیں رکھتا کہ کانگرس یا حکومت کے دائرہ میں زمام حکومت جس کے ہاتھ میں ہے وہ ہندو ہے یا مسلمان یا عیسائی۔ کیونکہ ان کے نظریہ کی رُو سے مذہب کو سیاسیات سے کوئی واسطہ ہے اور نہ ہی ہونا چاہیئے۔"

اور ایک مسلم قومیت پرست اسی نظریہ کو ان الفاظ میں دہراتا ہے:-

"لیکن ان کا (مسلمانوں کا) باہمی اختلاف جو زیادہ تر مذہبی رجحانات کا نتیجہ ہے کبھی دُور نہیں ہو سکتا اور اگر اس کے دور کرنے کی کوئی تدبیر ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ وہ کسی ایسے ادارے میں شریک ہو جائیں جو مذہبیات سے بالکل علیحدہ اور صرف سیاسیات سے تعلق رکھتا ہو اور ایسا ادارہ صرف کانگرس ہے۔" (مدینہ - ۱۳ راگست ۱۹۳۸ء)

ایک صاحب نے کہیں یہ اعتراض کیا کہ جواہر لال اور گاندھی مسلمانوں کے لیڈر کیسے ہو سکتے ہیں۔ اس کے جواب میں ایک مسلمان کانگرسی اخبار نے لکھا کہ:-

"اگر لیڈری سے مراد مسلمانوں کی دینی امامت و قیادت ہے تو یہ اعتراض درست ہے لیکن اگر اس سے مراد سیاسی راہنمائی ہے تو بے شک وہ قائد و امام ہو سکتے ہیں۔" (زمزم $\frac{9}{38}$ ۱۵)

"واردھا کی تعلیمی اسکیم" کے متعلق جب اعتراض کیا گیا کہ اس میں مذہبی تعلیم کا عنصر موجود نہیں تو اس کے جواب میں کانگرس کا آرگن "نیشنل ہیرلڈ" اپنی $\frac{11}{38}$ ۳ کی اشاعت میں لکھتا ہے:-

"مذہبی تعصب کو یہ چیز فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ اس ملک میں جہاں اتنے مختلف عقائد موجود ہیں قومی تعلیم کو مفید بنانے کی یہی تجویز ہو سکتی ہے کہ اسے قرآن یا شاستروں کے قوانین اور احکام سے نہ لادا جائے۔"

متحدہ قومیت کے علمبردار ایک ایسے مذہب کو جو جماعتی زندگی سکھاتا ہو کس قدر خطرناک سمجھتے ہیں۔ اس کا کچھ اندازہ پنڈت جواہر لال نہرو کے ان الفاظ سے لگ سکتا ہے۔ وہ اپنی سرگزشت میں لکھتے ہیں:-

"جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں اسے ہندوستان میں یا دوسری جگہ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اسے یکسر مٹا دینے تک کی آرزو کی ہے۔ قریب قریب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا۔ بے دلیل عقیدت اور تعصب کا۔ توہم پرستی اور لوگوں سے بے جا فائدہ اٹھانے کا۔ قائم شدہ حقوق اور مستقل حقوق کی بقا کا حامی ہے۔" (میری کہانی ص ۱۹۱)

لہٰذا متحدہ قومیت کی تشکیل کیلئے دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ مذہب اس قسم کا بنا دیا جائے جیسا دینِ الٰہی یا برہمو سماج جس کی داغ بیل اکبر نے ڈالی تھی اور جس کی تشریح مولانا آزاد نے اپنی تفسیر ترجمان القرآن میں کی ہے اور جب تک ایسا مذہب تیار نہ ہو سکے، اس وقت تک مذہب کو ایک پرائیویٹ عقیدہ کی حیثیت دی جائے جسے دنیاوی معاملات سے کوئی تعلق نہ ہو۔

عنصر سوم

آج مسلمان اپنا نام من حیث الجماعت الگ رکھتے ہیں اور ہندو الگ۔ یہ افتراق و اختلاف بھی متحدہ قومیت کی تعمیر میں سخت حائل ہے۔ لہٰذا قومیتِ متحدہ کی تشکیل کے لیے ضروری ہے کہ قوم کا نام بھی ایک ہو۔ ڈاکٹر سید محمود صاحب اپنے محولہ بالا مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:-

> "لفظ ہندی کو زبان کے لیے نہیں بلکہ اہل ہند کے لیے اختیار کرنا چاہیئے دنیا بھر میں صرف ہمارا ملک ہی ایسا ہے جس میں مختلف لوگ مذاہب سے شناخت میں آتے ہیں صرف اس کا اظہار ہی ہماری دماغی کیفیت کا آئینہ دار بن جاتا ہے اور ہمارے متعلق یہ ثابت کر دیتا ہے کہ ہم اس برّاعظم کی علیحدہ علیحدہ مذہبی اقوام ہیں اس لیے وقت آگیا ہے کہ ہم ایک مشترک نام اختیار کر لیں۔"

یہ اس لیے کہ جیسا کہ ہم مسٹر کے۔ ایم۔ علشی کی تقریر کے اقتباس سے واضح کر چکے ہیں۔ وطنیت اور متحدہ قومیت کا رشتہ مذہب کے رشتہ سے بلند و بالاتر ہے۔ اس لیے نام کا انتساب بالاتر رشتہ کی بنا پر ہونا چاہیئے۔ لہٰذا متحدہ قومیت کی تشکیل کے لیے تیسری ضروری چیز یہ ہوئی کہ مسلمانوں کا اپنا الگ اسلامی نام بھی نہ رہے۔

عنصر چہارم

متحدہ قومیت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس قوم کی زبان بھی ایک ہو۔ اس لیے کہ جب تک کسی قوم کی زبان مختلف ہوتی ہے وہ دوسری قوم کے اندر جذب نہیں ہو سکتی اور بغیر انجذاب و انضمام متحدہ قومیت کا وجود عمل میں نہیں آسکتا۔ الگ زبان کے وجود کے بقا کی تمنا کرنا فرقہ پرستی ہے جو قومیت پرستی کے بالکل متضاد جذبہ ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اپنے ایک مضمون میں ارشاد فرماتے ہیں:-

> "مگر بدقسمتی سے ابھی تک ہندوستان میں فرقہ پرستی طاقتور ہے اور اس بنا پر زبان میں علیحدگی پسندی کا رجحان بھی وحدت کے رجحان کے ساتھ ساتھ اپنا اثر برابر دکھائے جا رہا ہے۔ قوم پرستی کے پورے نشو و نما کے ساتھ یہ علیحدگی پسندی جو زبان کے معاملہ میں پائی جاتی ہے یقیناً فنا ہو جائے گی، ایک علیحدگی پسند حامی زبان کو آپ ذرا سے کھرچو تو دیکھو گے کہ وہ اندر سے فرقہ پرست ہے، بلکہ زیادہ تر تم اُسے ایک سیاسی رجعت پسند پاؤ گے۔"

عنصر پنجم

جب تک مسلمان اپنے مذہب کے پابند ہیں ان کے باہمی معاملات کا تصفیہ از روئے کتاب و سنت صرف مسلمانوں کی جماعت۔ ان کی اپنی مجلسِ شوریٰ اور اس مجلس کا امیر، مرکزِ ملت۔ ہی کر سکتا ہے۔ لیکن یہ اصول متحدہ قومیت کی تشکیل کے منافی ہے۔

متحدہ قومیت میں تمام معاملات کا فیصلہ ایک ایسی جمہوری حکومت کی طرف سے ہوگا جو تمام مختلف مذاہب کے مشترکہ مجموعہ پر مشتمل ہوگی اور جمہوریت کے اصول کے مطابق اکثریت کا فیصلہ ملک کا قانون بنا کرے گا اور اس جمہوریت کی بنا ہوگی۔ خالص وطنیت۔ مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی کانگرس پارٹی کے لیڈر فرماتے ہیں:۔

"اب یہ ناممکن ہوگا کہ کوئی ایسا نظام حکومت قائم کیا جائے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آچکا ہے کہ ہم اس امر کا اعتراف کر لیں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور انہیں خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اس بات کا تو تصور بھی ناممکن ہے کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظام حکومت قائم ہو سکتا ہے۔ عہد حاضر میں بہترین نظام حکومت کی بنا اس نظریئے پر قائم ہو سکتی ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتہ میں منسلک ہو کر ایک متحدہ قومیت بن جائیں۔" (ہندوستان ٹائمز مورخہ ۹/۵)

یہ نظریہ ایک ہندو کا ہی نہیں بلکہ خود مولانا حسین احمد صاحب کا بھی ارشاد ہے کہ:۔

"ایسی جمہوری حکومت میں بھی ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی سب شامل ہوں۔ حاصل کرنے کے لیے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہیئے۔ ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے اور اسلام اس آزادی کی اجازت دیتا ہے۔" (زمزم ۷ جولائی ۱۹۳۸ء)

اس جمہوریت میں اقلیت کی کیا حالت ہوگی۔ یہ جنگ آزادی کے "قائد اعظم" کی زبان سے سنیئے:۔

"دراصل جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھتی ہے۔" (میری کہانی از پنڈت جواہر لال نہرو صفحہ ۴۵۵ جلد دوم)

لہٰذا متحدہ قومیت کی تعمیر کا پانچواں رکن یہ ہوا کہ اس میں نظام حکومت ایسی جمہوریت پر قائم ہوگا جو مسلم و غیر مسلم کی جماعتوں پر مشتمل ہوگی اور جس میں اکثریت کے فیصلے ملک کا قانون بنا کریں گے۔

یہ ہے مختصراً متحدہ قومیت کا تصور اور اس کے عناصر ترکیبی۔ اس کے برعکس اگر مسلمان چاہیں کہ من حیث المسلم اپنا الگ جماعتی تشخص قائم رکھیں تو یہ جذبہ فرقہ پرستی کا وہ شجر ملعونہ ہے جو متحدہ قومیت کی جنت ارضی میں کسی صورت میں بار آور نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو فرماتے ہیں:۔

"ہندوستان میں مسلم قومیت پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ بس یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم موجود ہے جو یکجا نہیں منتشر ہے مبہم ہے اور غیر متعین ہے۔ اب سیاسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے اور معاشی نقطۂ نظر سے یہ بہت دور از کار ہے..... مسلم قومیت کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ہی نہیں۔ بس مذہبی اخوت کا رشتہ ہی ایک چیز ہے۔" (میری کہانی جلد دوم صفحہ ۳۳۱)

پھر فرماتے ہیں:۔

"مسلم قوم کا تخیل تو صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اس قدر

اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے اور اگر زیادہ لوگوں کو اس پر اعتقاد ہوتا بھی تو حقیقت سے دوچار ہونے کے بعد اس کا خاتمہ ہو جاتا۔" (میری کہانی جلد دوم صفحہ ۳۲۲)

کس قدر تاسف سے لکھتے ہیں کہ:-

"ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں، گویا دو ملتوں اور دو قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں۔" (میری کہانی جلد دوم صفحہ ۳۳۱)

خود مولانا صاحب اس خیال کی تائید ان "حقیقت کشا" الفاظ میں فرماتے ہیں:-

"ہندو مہاسبھا ویسے ہی ہندوؤں کی الگ جماعت ہے، جیسے مسلم لیگ مسلمانوں کی۔ کانگریس ہندوستان میں بسنے والے ہر ہندوستانی کی جماعت ہے۔" (زمزم ۷ جولائی ۱۹۳۸ء)

یعنی مولانا صاحب کے نزدیک بھی پنڈت جی کی طرح مسلمانوں کی الگ جماعت کا وجود نہایت قابلِ نفرت چیز ہے اور قابلِ فخر جماعت وہی ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے امتزاج سے متحدہ قومیت کی بنیاد پر استوار ہو۔

تجزیہ

تفصیلات بالا سے ہم نے دیکھ لیا کہ متحدہ قومیت کے اجزائے ترکیبی کیا کیا ہونے ضروری ہیں، چند الفاظ میں یوں سمجھئے کہ متحدہ قومیت میں:-

(۱) مختلف قوموں کی تہذیب کو مٹا کر اسے ایک جدید تہذیب میں منتقل کر دیا جائے گا۔

(۲) مختلف جماعتوں کے جداگانہ مذاہب کی تحلیل سے ایک مرکب مذہب تیار کیا جائے گا اور جب تک وہ تیار نہ ہوگا۔ اس وقت تک مذہب کو محض ایک پرائیویٹ عقیدہ سمجھا جائے گا۔

(۳) مختلف قوموں کا الگ الگ نام بھی باقی نہ رہے گا۔ بلکہ ایک مشترکہ نام بنا بر وطنیت اختیار کیا جائے گا۔

(۴) مختلف جماعتوں کی زبان بھی جداگانہ نہیں ہوگی بلکہ اکثریت کی زبان متحدہ زبان قرار پائے گی۔

(۵) متحدہ قومیت کا نظام ایک ایسی جمہوریت سے مرتب ہوگا جو تمام اقوام کے امتزاج سے قائم ہوگا اور جس کی رُو سے اکثریت کے فیصلے ملک کا قانون بنا کریں گے۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ

متحدہ قومیت میں مسلمانوں کو اپنا الگ قومی تشخص (NATIONAL IDENTITY) قائم رکھنے کی اجازت نہ ہوگی۔

لہٰذا

متحدہ قومیت کے معنی یہ ہوئے کہ ایک ملک میں بسنے والی مختلف قوموں کو بنا بر وطنیت اس طرح آپس میں ملایا جائے کہ ان کی جداگانہ تہذیب، تمدن، نام، زبان، مذہب باقی نہ رہے۔ بلکہ ان کے امتزاج سے ایک مشترکہ اور متحدہ تہذیب، تمدن، نام، زبان اور مذہب کا وجود عمل میں لایا جائے اور وہ سب مل کر ایک ایسے دستور العمل کے تحت زندگی بسر کریں جسے اس متحدہ قومیت کی جمہوری حکومت چلائے۔

یہ نظام کس طرح قائم کیا جائے گا اس کی تفصیل بھی پنڈت جواہر لال نہرو کی زبان سے سُن لیجئے۔ فرماتے ہیں:-

"سوسائٹی کی موجودہ کش مکش یعنی قومی جنگ اور پھر طبقات کی جنگ کا تصفیہ جبر کے سوا کسی اور صورت سے ممکن نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پہلے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کا کام بہت بڑے پیمانہ پر کرنا پڑے گا۔ کیونکہ جب تک بہت بڑی جماعت ہم خیال نہ ہو جائے اس وقت تک نظام تمدن کو بدلنے کی کوئی تحریک مضبوط بنیاد پر قائم نہ ہو سکے گی۔ لیکن اس کے بعد تھوڑے سے لوگوں پر جبر کرنے کی ضرورت ہوگی۔" (میری کہانی صفحہ ۴۷۰ - ۴۶۹)

معانی متعین ہو گئے۔ ارباب نظر کے لیے تو اس کی شاید ہی ضرورت ہو کہ اب دلائل و براہین سے یہ ثابت کیا جائے کہ اس قسم کی متحدہ قومیت کشی، امت کو اپنے ہاتھوں اندھیوں کے سامنے گنگا میں ڈبو دینے کے مترادف ہے۔ لیکن چونکہ مولانا صاحب اس متحدہ قومیت کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس کی تشکیل مذہبی فریضہ کی حیثیت رکھتی ہے اور (معاذ اللہ) اس کی بنیاد خود نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے رکھی تھی۔ اس لیے آئندہ صفحات میں یہ واضح کیا جائے گا کہ فی الواقعہ بجز ہنوز رموز دیں نمی داند" پہلے مولانا صاحب کے دلائل پیش کیے جائیں گے۔

باب سوم

متحدہ قومیت اور اسلام

مولانا صاحب نے اپنے دعوےٰ کے اثبات میں سب سے پہلے یہ دلیل پیش کی ہے کہ قرآن کریم میں جہاں مختلف انبیائے کرام علیہم السلام کی قوموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان قوموں میں مومن و کافر دونوں شامل تھے۔ لہذا اس سے ثابت ہوا کہ مومنین و کافرین کے امتزاج سے متحدہ قومیت بن سکتی ہے۔ لفظ قوم کی بحث کے دوران میں ارشاد ہے کہ:-

"جس جگہ (یہ لفظ) مضاف واقع ہوا ہے اور مضاف الیہ مسلمان نہ ہو یا پیغمبر ہے اور کلام غیر مسلم کے متعلق ہے تو یقیناً اس جگہ پر مشرکوں اور کفار کا پیغمبر یا مسلمانوں کے ساتھ قومیت متحدہ میں منسلک ہونا ہی مفہوم ہوتا ہے۔ کذبت قوم نوح المرسلین۔ کذبت قبلھم قوم نوح واصحاب الرس ...... الخ (متحدہ قومیت اور اسلام ص۱۷)

اسی قسم کی اضافتوں کی مثالوں کے بعد فرماتے ہیں:-

"غرضیکہ اس قسم کی بے شمار آیتیں ہیں جن میں غیر مسلموں کو اور پیغمبر کو ایک قوم بتایا گیا ہے اور ان کفار کو پیغمبر کی طرف بوجہ اتحاد نسب یا اتحاد وطن وغیرہ نسبت کیا گیا ہے" (ایضاً ص۱۹)

چنانچہ خود نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق لکھتے ہیں کہ:-

"یا ایھا النبی سے جناب رسول اللہ اور دوسرے پیغمبروں کو بعد تقرر دین و شریعت کہا جاتا ہے۔
قل یا قوم اعملوا علی مکانتکم انی عامل۔ الآیہ۔
کہہ دو کہ اے میری قوم تم اپنی جگہ پر عمل کرو۔ میں اپنی جگہ پر عمل کرتا ہوں۔"

اس کے بعد ان آیات سے حسبِ ذیل نتائج مستنبط فرماتے ہیں :-

"الغرض یہ آیتیں صاف طور سے واضح کر رہی ہیں کہ :-

(الف) قرآن کے نقطۂ نظر اور استعمال میں لفظ قوم اپنے معنی کی حیثیت سے مسلمانوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ وہ ہر اس جماعت پر بولا جائے گا جس میں کوئی رابطہ ہو۔ خواہ نسب کا یا وطن کا۔ یا پیشہ یا زبان کا۔

(ب) قومیت میں اشتراکِ مسلم و کافر ہو سکتا ہے اور قرآن کے استعمال میں یہ موجود ہے۔

(ج) پیغمبر بھی اتحادِ قومیت میں کافر و مشرک اور فاسق کے ساتھ دنیا میں تعلق رکھ سکتا ہے اور رکھتا ہے"

(متحدہ قومیت اور اسلام ص۲۲)

ہمارا خیال ہے کہ اس دلیل کو پڑھ کر آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی ہوگی کہ حضرت علامہ کیوں بلک بلک کر روتے تھے اور ہندوستان میں اسلام کے مستقبل پر کیوں خون کے آنسو بہاتے تھے۔ جس قوم کے سب سے بڑے دارالعلوم کے سب سے بڑے عالم کی قرآن فہمی کی یہ حالت ہو، اس قوم کے مستقبل کا خدا حافظ۔ یہی وہ احساس دردانگیز تھا جس کی بنا پر حضرت علامہؒ کا جگر شق ہو جاتا تھا اور ہجومِ غم و فورِ الم کبھی سیلابِ اشک بن کر اُمنڈ آتا اور کبھی یک آہِ سحرگاہی کی صورت میں "بہ حضورِ حق" یوں نالہ کش ہوتا کہ ؎

بآں قومے از تو میخواہم کشادے فقیہش بے یقینے، کم سوادے
بسے نادیدنی را دیدہ ام من ! "مرا اے کاشکے مادر نہ زادے"

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم نے مختلف انبیاء کرامؑ کے نام سے ان اقوام کو منسوب کیا ہے جو ان کے بیانات کی اوّلیں مخاطب تھیں۔ لیکن اس انتساب سے مقصد محض تعارف تھا۔ (وجعلنکم شعوبا و قبائل لتعارفوا) ہم نے تمہارے قبیلے اور خاندان اس لیے بنائے کہ تم پہچانے جاؤ۔) مثلاً حضرت نوحؑ جس قوم کی طرف مبعوث ہوئے اس قوم کے متعلق قرآن کریم میں جہاں کچھ ذکر آئے گا تو لامحالہ اُسے قومِ نوحؑ ہی کہنا پڑے گا [۲] اس کے علاوہ اس قوم کے ذکر کرنے کا اور کون سا طریقہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس قوم کا کوئی دوسرا نام ہی نہ تھا۔ لیکن اس سے یہ کیسے لازم آگیا کہ اس قوم کے "کافر و مومن مل کر ایک متحدہ قومیت کے رشتہ میں منسلک ہو جاتے تھے"۔ نبی کی بعثت کے وقت ایک قوم موجود ہوتی تھی۔ کبھی اسے اُس نبی کی قوم کہہ دیا جاتا۔ اگر وہ کسی اور نام سے منسوب ہوتی تو وہ نام لے دیا جاتا۔ مثلاً قومِ عاد۔ قومِ ثمود۔ کبھی اسے اس کے کسی سردار کی طرف منسوب کر دیا جاتا۔ جیسے قومِ فرعون۔ پھر اس قوم میں سے ایک جماعت ایمان لے آتی۔ اُن کی اس وحدتِ تخیل اور وحدتِ عمل کی بنا پر انھیں دوسرے لوگوں سے متمیز کرکے مومنین کی جماعت کہا جاتا۔ جو اس قوم میں سے انکار و تکذیب کرتے انھیں کفار کی جماعت کہا جاتا۔ قرآن کریم میں جہاں مختلف انبیاءؑ کرامؑ کے نام سے مختلف قومیں منسوب ہیں۔ وہاں ان قوموں میں سے دو مختلف جماعتوں کا ذکر الگ الگ موجود ہے۔ اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ متحدہ قومیت میں کسی الگ جماعت کا ذکر یا نام یا تشخص۔ یا جُداگانہ قومی وجود اصولِ قومیت کے خلاف ہوتا ہے۔ پھر قرآن کریم نے ہمیں یہ بھی بتا دیا ہے کہ ان ہر دو جداگانہ جماعتوں کے باہمی تعلقات کیسے ہوتے تھے اور اُن کا الگ الگ انجام کیا ہوا کرتا تھا۔ متحدہ قومیت میں اتنی بات تو ظاہر ہے کہ اگر ڈوبے گی تو تمام قوم ڈوبے گی۔ اگر اُبھرے گی تو ساری کی ساری قوم اُبھرے گی۔

---

[۱] ارمغانِ حجاز ص۱۲۔ [۲] جیسے ہم اُردو میں کہیں گے ۔ وہ لوگ جن کی طرف حضرت نوحؑ مبعوث ہوئے تھے۔

بن تو ہو نہیں سکتا کہ اس متحدہ قوم کا ایک حصہ، سرفرازی و سربلندی، عزت و وقار، جاہ و حشمت، سطوت و حکومت کی زندگی بسر کر رہا ہو اور کوئی دوسرا حصہ ذلت و مسکنت، تباہی و بربادی، افلاس و نکبت کے ہولناک عذاب میں مبتلا ہو۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جن اقوام کو مولانا صاحب انبیائے سابقین کی متحدہ اقوام قرار دیتے ہیں، ان کی یہ حالت ہوتی تھی کہ ان میں سے ایک جماعت (مومنین) کامیاب و کامران ہوتی۔ اور دوسری جماعت (کافرین) تباہی و بربادی کے جہنم میں دھکیل دی جاتی۔ سارا قرآن کریم اسی قسم کے نزائر سے بھرا پڑا ہے۔ اور ہم تو یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم کی تمام تعلیم کا ماحصل یہ ہے کہ کفر و ایمان کے نتائج میں بیّن فرق کر کے بتا دے۔ ہم یہاں صرف ایک سورت (ہود) کی چند آیات پیش کرتے ہیں۔ رکوع دوم کے آخیر دو قسم کی جماعتوں کا ذکر ہے۔ ایک وہ جن کے متعلق ارشاد ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ... (۱۱/۲۳) ایمان والوں کی جماعت) دوسری وہ جس کے متعلق فرمایا۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَھُمْ (۱۱/۲۱ کفار کی جماعت) پھر ان کا باہمی موازنہ ان الفاظ میں فرمایا کہ ان کی شناخت میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہے۔

مَثَلُ الْفَرِیْقَیْنِ کَالْاَعْمٰی وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِیْرِ وَالسَّمِیْعِ۔ ھَلْ یَسْتَوِیٰنِ مَثَلًا (۱۱/۲۴)

ان ہر دو جماعتوں (فرقوں) کی مثال اندھے اور بہرے اور دیکھنے اور سننے والے کی مثال ہے کیا یہ دونوں کبھی برابر ہو سکتے ہیں؟ قرآن کریم نے یہاں لفظ فریقین استعمال کیا ہے جو آپ کی دورِ حاضرہ کی سیاست میں (COMMUNITIES) کا ترجمہ ہے اور یہی وہ چیز ہے جسے (COMMUNALISM) یعنی فرقہ پرستی کہا جاتا ہے جو متحدہ قومیت کی بالکل ضد ہے۔

اس تمہید کے بعد تیسرے رکوع سے اُمم سابقہ کے واقعات کا بیان شروع ہوتا ہے۔ سب سے پہلے حضرت نوحؑ کی قوم کے تذکرہ کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِہٖٓ (۱۱/۲۵)

اور یقیناً ہم نے نوحؑ کو اُس کی قوم کی طرف بھیجا۔

ایک قوم تھی جس کی طرف حضرت نوحؑ کو بھیجا۔ اس کے بعد اس قوم کے مومنین اور منکرین کا ذکر آتا ہے۔ منکرین کی سرکشی اور بغاوت کا بیان ہے۔ کشتی اور طوفان کا تذکرہ ہے۔ آخیر میں اس قوم کے دو فریقوں کو بالکل الگ کر کے دکھا دیا گیا ہے۔ ایک وہ جو نذرِ طوفان ہو گیا۔ دوسرا وہ جو حضرت نوحؑ کے ساتھ محفوظ و مصئون زندہ رہا۔ جن کے متعلق ارشاد ہے۔

قِیْلَ یٰنُوْحُ اھْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَکٰتٍ عَلَیْکَ وَعَلٰٓی اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَکَ (۱۱/۴۸)

کہا گیا کہ اے نوحؑ ہماری طرف سے سلامتی کے ساتھ اُترو۔ اور تم پر اور جو لوگ تمہارے ساتھ ہیں اُن پر برکات ہوں۔

فرمائیے! یہ کس قسم کی متحدہ قومیت تھی جس کی دو جماعتوں میں یوں تفریق ہوئی۔ پھر چوتھے رکوع میں حضرت ہودؑ کی قوم عاد کا ذکر ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ ..... (۱۱/۵۰)

اور عاد کی طرف ان کا بھائی ہود (بھیجا) جس نے کہا کہ اے میری قوم، اللہ کی عبودیت اختیار کرو۔

پھر اس قوم کے کفار اور مومنین کی الگ الگ جماعتوں کا ذکر ہے اور انجام کار بتایا گیا ہے کہ نہ ماننے والوں پر تباہی اور بربادی کا عذاب نازل ہوا اور مومنین کی جماعت کے متعلق ارشاد ہوا۔

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّیْنَا ھُوْدًا وَّالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ بِرَحْمَۃٍ مِّنَّا ..... (۱۱/۵۸)

اور جب ہمارا حکم آپہنچا تو ہم نے ہودؑ کو اور اُن لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لا چکے تھے اپنی رحمت سے بچا لیا۔

چھٹے رکوع میں حضرت صالحؑ کی قوم ثمود کا ذکر شروع ہوتا ہے (۱۱/۶۱) اور اس قوم کی سرکشی اور فرمانبرداروں کا علیحدہ تفریق کے بعد قوم مؤمنین کے متعلق انہی الفاظ کا اعادہ ہوتا ہے جو مذکورہ صدر آیت میں مندرج ہیں۔

ساتویں رکوع میں قوم لوطؑ کا ذکر ہے۔ اس قوم کو بھی انہی دو گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ منکرین پر عذاب نازل ہوتا ہے اور مؤمنین کی جماعت حضرت لوطؑ کے ساتھ محفوظ رکھی جاتی ہے۔ (۱۱/۸۱)

آٹھویں رکوع میں حضرت شعیبؑ کی قوم مدین کا ذکر ہے اور ان کی حسبِ صدر تفریق کے بعد قوم مومنین کے متعلق آیت مندرجہ بالا کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ (۱۱/۹۴)

پھر حضرت موسیٰؑ کی قوم اور فرعون کی تباہی کا ذکر ہے اور ان انبیاء کرامؑ اور ان کی اقوام کی مومن و کافر جماعتوں کے انجام کے تذکرہ کے بعد نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ آپ کے سامنے بھی اس قوم مخاطب کے دو گروہ ہیں۔ ایک تو مَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ والا (جماعت مومنین) اور دوسرا مَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ بِالطَّاغُوْتِ والا (جماعت کفار) اور اس دوسری جماعت کے متعلق فرمایا۔

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنَّا عٰمِلُوْنَ (۱۱/۱۲۱)

اور اُس کفار کی جماعت سے کہہ دیجئے کہ تم اپنا کام کیے جاؤ ہم اپنی جگہ کام کیے جاتے ہیں۔

وَانْتَظِرُوْا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ٥ (۱۱/۱۲۲)

تم بھی (انجام کا) انتظار کرو۔ ہم بھی انتظار کرتے ہیں!

آپ ان حقائق قرآنی کو سامنے رکھیئے اور پھر اپنی بصیرت سے فتویٰ طلب فرمائیے کہ کیا ان سے واقعی متحدہ قومیت کے دعویٰ کا ثبوت ملتا ہے یا اس بات کا کہ وہ لوگ جو نبی پر ایمان لاتے تھے اور اس کا اتباع کرتے تھے۔ وہ ایک الگ جماعت کے افراد ہوتے تھے (جنہیں اِنَّا یعنی ہم کہا گیا ہے) اور دوسرے لوگ الگ گروہ پر مشتمل ہوتے تھے۔ (جنہیں کُمْ یعنی تم کہہ کر پکارا گیا ہے) اب یہ ظاہر ہے کہ "ہم" اور "تم" کی تفریق سیاستِ حاضرہ کی اصطلاح میں فرقہ پرستی کہلاتی ہے اور متحدہ قومیت کی تشکیل اس وقت ہوتی ہے، جب "ہم" اور "تم" کا امتیاز یوں مٹ جائے کہ:-

تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری!

پھر یہ بھی دیکھئے کہ ان ہر دو مختلف گروہوں کے باہمی تعلقات کیسے ہوتے تھے۔ کیا حضرات انبیاء کرامؑ اور ان کے متبعین کی جماعت کفار کی جماعت کے ساتھ یوں گھل مل کر رہتی تھی کہ ان کی تہذیب ایک ہو جائے تمدن ایک ہو جائے۔ نظریاتِ زندگی ایک ہو جائیں۔ یا مومنین کی جماعت کفار کی جماعت سے برأت اور بیزاری علیحدگی اور قطع تعلق کا اعلان فرمایا کرتی تھی۔ یہاں تک کہ خدا نے یہ حکم بھی دیا تھا کہ کفار کی تباہی کے اوپر افسوس بھی نہ کرو۔

فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۔ (المائدہ)

قوم کفار (کی بربادی) پر تاسف بھی نہ کرو۔!

بلکہ اُن کی تباہی اور بربادی پر تو خوشی اور مسرت کے سجدہ ہائے شکر ادا کرنے کا حکم ہے کہ جسدِ انسانی سے ایسا مادۂ فاسدہ کا نکل جانا عین صحت ہے۔ فرمایا:-

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ (انعام)

پھر ان ظالموں کی جڑیں کٹ گئیں۔ سو اللہ رب العالمین کے لیے سب تعریف ہے۔

ملتِ حنیفہ کے موسس اولیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی حیاتِ طیبہ کو قرآن کریم نے مومنین کے لیے اُسوۂ حسنہ قرار دیا ہے۔ غور فرمائیے کہ اس باب میں ان کا مسلک کیا تھا۔ اور قرآن کریم نے کس مقام پر اُن کے طرزِ عمل کو بطور نمونہ پیش کیا ہے۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۡ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ ۔ (۶۰/۴)

یقیناً تمہارے لیے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں کی زندگی میں ایک بہترین نمونہ ہے۔ جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور جو کچھ تم اللہ کے سوا پوجتے ہو ان سے بیزاری کا اعلان کرتے ہیں ہم تمہارے منکر ہیں اور ہم میں اور تم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عداوت اور بغض ظاہر ہے جب تک کہ تم اللہ واحد پر ایمان نہ لے آؤ۔

دیکھیے "اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ" ایک جماعت کا نام ہے اور "قَوْمِهِمْ" ایک دوسری جماعت ہے اور ان دونوں میں بغض اور عداوت ظاہر ہے۔ تاوقتیکہ کفار کی جماعت ایمان نہ لے آئے۔ فرمائیے یہ عداوت اور بغض کے تعلقات متحدہ قومیت ہی کا ثبوت دیتے ہیں۔ یا متحدہ قومیت کے لیے حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ کی شرط بھی ضروری ہے۔ ذرا آج ہندوؤں سے کہیئے کہ تمہارے اور ہمارے درمیان ہمیشہ کے لیے بغض و عداوت رہے گی تاوقتیکہ تم ایمان لے آؤ۔ پھر دیکھئے کہ وہ آپ کو کس طرح متحدہ قومیت کا جزو تسلیم کرتے ہیں۔ يَا مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ کے اُسوۂ حسنہ کے اتباع میں اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ پر عمل نہیں صرف اس کا اعلان ہی کر دیجئے پھر دیکھئے کہ یہ بڑے بڑے وسیع الظرف قومیت پرستی کے اوتار جناب کی نسبت کیا فیصلہ صادر فرماتے ہیں۔

مولانا صاحب، قومِ نوح، قومِ موسیٰ وغیرہ کی مثالوں سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت کر سکتے تھے کہ کفار اور مومنین کی جماعتوں کو ایک مشترکہ نام سے بھی موسوم کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہوگی کہ اُمتِ محمدیہ کی صورت میں اس نتیجہ سے بھی کچھ فائدہ نہ اٹھایا جا سکے گا۔ اس لیے کہ جن کے متعلق خود اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا ہو هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ (اُس نے تمہارا نام مسلمان رکھا) کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ اُس قوم کا نام بھی کچھ اور رکھ سکے۔

یہ تھی متحدہ قومیت کے ثبوت میں مولانا صاحب کی پہلی دلیل۔

دوسری دلیل

متحدہ قومیت کے ثبوت میں مولانا صاحب نے دوسری دلیل اُسوۂ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیش کی ہے، فرماتے ہیں۔

"جناب رسول اللہ صلعم نے اپنی رسالت کے چودہ برس گزر جانے کے بعد مدینہ منورہ میں وہاں کے اور اپنے ساتھ کے مہاجر و انصار مسلمانوں اور مدینہ کے یہودیوں کو ملا کر ایک متحدہ قوم اور متحدہ اُمت بنائی اور نہایت مفصل عہد نامہ اس امر

کے متعلق تحریر فرمایا اور اس میں تحریر کر دیا گیا کہ مشروط اور مذکورہ اُمور میں دشمنوں کے مقابل مسلمان اور یہود ایک اُمّتِ متحدہ ہوں گے مگر ہر ایک اپنے اپنے مذہب کا پابند ہوگا۔" (متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ ۴۳)

اس کے بعد مولانا صاحب نے اس "معاهدہ" کا ذکر فرمایا ہے جو مسلمانوں اور یہودیوں کی "متحدہ قومیت" کے مابین ہوا تھا۔ بات یوں تھی کہ مدینہ منورہ میں مسلمانوں کے علاوہ یہودی بھی رہتے تھے۔ مدینہ منورہ کی حفاظت کی ذمہ داری دونوں پر عائد ہوتی تھی۔ اس لیے حضورؐ نے مسلمانوں کی جماعت اور یہودیوں کی جماعت کے درمیان ایک معاہدہ کیا جس کی رُو سے قرار پایا کہ اگر کوئی دشمن باہر سے حملہ آور ہوگا تو دونوں معاہد جماعتیں متحدہ طور پر اس کی مدافعت کریں گی۔ اس سے مولانا صاحب استنباط فرماتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے مسلمانوں اور یہودیوں کو ملا کر ایک قوم بنا کر متحدہ قومیت کی تشکیل فرمائی تھی۔ (رسالہ مذکور صفحہ ۴۹)

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے!

مولانا صاحب نے اس دلیل کو یہاں پہلی مرتبہ ہی نہیں پیش کیا بلکہ وہ اسے اکثر اپنی تقریروں میں دہراتے رہتے ہیں اور بزعم خویش سمجھ لیتے ہیں کہ متحدہ قومیت کے ثبوت میں اس محکم دلیل اور عروۃ الوثقیٰ کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ اگر وہ کبھی ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں تو اُن پر شاید یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ واقعہ تو ان کے دعوے کی بنیادوں تک کو متزلزل کر دیتا ہے۔ یہ بات ایک "ابجد خواں" بھی جانتا ہے کہ معاہدہ ہمیشہ دو مختلف اقوام میں ہوا کرتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ مدینہ کے مسلمانوں کا اور وہاں کے یہودیوں کا وطن ایک تھا۔ اب اگر متحدہ قومیت کی تعمیر کے لیے اشتراکِ وطن ہی ایک شرط ہو تو مدینہ کے مسلمان اور یہود تو اس اعتبار سے خود بخود ایک متحدہ قوم ہونے چاہئیں۔ اس متحدہ قوم میں معاہدہ "خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے۔ اس معاہدہ کا وجود ہی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مسلمان ایک ملک بلکہ ایک شہر میں رہتے ہوئے بھی غیر مسلموں کے ساتھ ایک قوم نہیں بن سکتے۔ مکہ کے مسلمان اور مدینہ کے مسلمان بلکہ حبش اور روم اور فارس کے مسلمان ایک قوم کے افراد ہوں گے۔ لیکن مدینہ کے مسلمان اور یہود ایک قوم نہیں بن سکیں گے۔ ان میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے معاہدہ کی ضرورت پڑے گی۔ نبی اکرمؐ نے یہود اور مسلمانوں کے امتزاج سے ایک متحدہ قومیت کی تعمیر نہیں کی تھی۔ بلکہ اس معاہدہ کی رُو سے دو مختلف اقوام میں باہمی اشتراکِ عمل اور اتحادِ محاذ کی شکل پیدا کی تھی۔ . . . .

. . . . اور یہ وہ شکل تھی جسے قرآن کریم بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ سے تعبیر کرتا ہے۔ غور فرمائیے اس آیۂ مقدسہ میں ایک چیز ہے كُمْ (تم) اور دوسری چیز ہے هُمْ (وہ یعنی غیر مسلم) اور ان دونوں کے درمیان رابطۂ اتحاد پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ میثاق۔ متحدہ قومیت کو چھوڑیئے اس کا تو تصوّر ہی یکسر غیر قرآنی ہے۔ کفر و اسلام۔ مومن و کافر کا باہم گر یوں مل جانا کہ انہیں آپس میں کسی معاہدہ کی ضرورت نہ رہے۔ تلبیسِ حق و باطل کی ایسی خوفناک مثال ہے جس سے روح کانپ اُٹھتی ہے۔ اسلام کی رُو سے تو مسلم اور غیر مسلم جماعتوں میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے بھی میثاق کی ضرورت ہے جس کے بغیر وہ ایک دوسرے کے ساتھ اجتماعی حیثیت سے اشتراکِ عمل نہیں کر سکتے۔ اور اشتراکِ عمل بھی صرف ان امور میں کر سکیں گے جو اس معاہدہ میں مشروط و مذکور ہوں گے۔ اب خدا یہ فرمائیے کہ جس طرح نبی اکرمؐ نے مدینہ کے یہود کے ساتھ معاہدہ کر کے اتحاد پیدا کیا تھا۔ آپ حضرات نے ہندوؤں کی جماعت کے ساتھ کونسا ایسا معاہدہ کیا ہے۔ معاہدہ کا سوال تو بعد میں پیدا ہوتا ہے، وہ تو جیسا کہ پہلے لکھا ہے آپ کی جداگانہ قومیت ہی کو تسلیم نہیں کرتے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی تحریروں کے اقتباسات آپ دیکھ چکے ہیں۔ وہ اس کا علانیہ تمسخر اڑاتے ہیں اور اک جواہر لال پر ہی کیا

موقوف ہر وہ شخص (ہندو ہو یا مسلمان) جو متحدہ قومیت کا حامی ہے وہ مسلمانوں کی جدا قومیت کے دعوے کو مذہبی جنون سے تعبیر کرتا ہے۔ ایسا دعویٰ کرنے والوں کو ساحرین برطانیہ کے جادو کا مسحور بتاتا ہے۔ رجعت پسند کہتا ہے۔ اُس کا نام ٹوڈی رکھتا ہے۔ یعنی وہ شخص جو ہندو مسلم اتحاد کے لیے اس راہِ عمل کو اختیار کرتا ہے جو قرآن کریم نے تجویز فرمائی اور جس پر خود نبی اکرمؐ نے عمل کر کے دکھایا۔ وہ آج ـــــ ہندوؤں کی نگاہ ہی میں نہیں بلکہ قومیت پرست مسلمانوں کی نگاہ میں، اور عام مسلمانوں کی نگاہ میں نہیں۔ بلکہ کتاب و سنت کے علمبردار ہونے کے مدعیوں کی نگاہ میں۔ مسلمانوں کا دشمن اور اسلام سے غداری کرنے والا ہے۔ اور جو اس متحدہ قومیت کا مدعی ہے، جو یورپ کی تنگ نظری کی ایجاد ہے۔ جسے ہندو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ایسا درخشاں اور تابناک بنا کر پیش کر رہا ہے، اور جس کے ماننے سے قصرِ اسلام کی بنیادیں ہل جاتی ہیں وہ شخص واقفِ اسرارِ دین ہے۔ سرفروش و جانباز مجاہد ہے۔ ملتِ اسلامیہ کا بہترین نمائندہ ہے۔ مسلمانوں کا صحیح ترجمان ہے۔ لہٰذا امام الہند ہے۔ "امیر المومنین" ہے۔ یا للعجب ؎

چنیں دورِ آسماں کم دیدہ باشد که جبریلِ امیں را دل خراشد
چہ خوش دیرے بنا کردند آنجا پرستد مومن و کافر تراشد!
(اقبالؒ)

کبھی یہ حضرات ہندوؤں سے الگ ہو کر بات سنیں تو انہیں بتایا جائے کہ حضرت علامہ یا اُن کے ہم مسلک حضرات جو مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے مدعی ہیں، وہ انگریز کے مقابلہ میں ہندوؤں کے ساتھ مشترکہ محاذ قائم کرنے کے لیے بالکل اسی طریقِ عمل کو اختیار کرنا چاہتے ہیں جو نبی اکرمؐ نے اختیار فرمایا تھا۔ یعنی مسلمانوں کی الگ جماعتی حیثیت کو تسلیم کرا کر ہندوؤں کے ساتھ من حیث الجماعت ایک معاہدہ کیا جائے اور اس معاہدہ کی رُو سے ہندو مسلم اتحاد پیدا کر کے صحیح آزادی حاصل کی جائے۔ لیکن ہندو چونکہ مسلمانوں کی جداگانہ جماعتی حیثیت کو فنا کر دینے کے منصوبے باندھ چکا ہے۔ اس لیے وہ اسے تسلیم کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتا، اور سادہ لوح مسلمانوں کو یہ کہہ کر اپنے زنار کی لپیٹ میں لے لیتا ہے کہ یہ مطالبہ ہندو مسلم متحدہ قومیت کے راستہ میں ایک سخت روڑا ہے اور انگریز کا پیدا کردہ ہے۔ اب مسلمان ہے کہ بلا سوچے سمجھے ہر جگہ یہی راگ الاپنا شروع کر دیتا ہے اور یوں حریفانِ کوتہ آستیناں کا آلہ کار بن کر اسی شاخ کو کاٹنے لگ جاتا ہے جس پر خود اس کا نشیمن ہے۔ چونکہ یہ مسلک ہندو کے مفاد کے عین مطابق ہے اس لیے وہ ایسے مسلمانوں کی بے حد تعریف کرتا ہے۔ انھیں آزادیٔ وطن کا پرستار کہتا ہے۔ ہر جگہ ان کا سواگت کرتا ہے۔ ان کے چرنوں میں اپنی شردھا کے پھول چڑھاتا ہے۔ شری جی اور دیش بندھو کہہ کر ڈنڈوت کرتا ہے اور یوں ملتِ اسلامیہ کی وحدت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے انھیں اپنی قومیت کی دیوار میں چنتا جاتا ہے۔ کس قدر صحیح کہا ہے اس مردِ حق آگاہ نے جسے فطرت کی کرم گستری نے بصیرتِ قرآنی اس قدر فراواں عطا فرمائی تھی۔ فرماتے ہیں ؎

نگہ دارد برہمن کارِ خود را نمی گوید بہ کس اسرارِ خود را
بمن گوید کہ از تسبیح بگذر بدوشِ خود برد زنارِ خود را!
(اقبالؒ)

باب چہارم

مسلم وغیر مسلم کے تعلقات

موالات

قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ انسانوں کے باہمی تعلقات کو دو شعبوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک وہ جسے وہ موالات کہتا ہے۔ جس کے معنی ہیں قلبی تعلقات۔ ایک دوسرے پر کامل اعتماد۔ پورا پورا دلی بھروسہ۔ ایسے تعلقات جو شرائط و قیود کی سطح سے بلند ہوں۔ جن میں قلب کو اتنا اطمینان حاصل ہو کہ حاضر و غیب دوسرے پر بھروسہ کیا جا سکے اور یہ یقین ہو کہ میرے تمام مفاد دوسرے کے ہاتھ میں محفوظ ہیں۔ ظاہر ہے کہ متحدہ قومیت میں اسی قسم کے تعلقات کا تقاضا ہوگا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے کسی مسلم کا غیر مسلم کے ہاتھ اس قسم کے تعلقات قائم کرنا جائز ہے یا نہیں۔ قرآن کریم میں موالات کے متعلق ارشاد ہے۔

> "اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست (ولی) ہیں۔ نیک باتوں کی تعلیم دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں۔ زکوٰۃ دیتے ہیں، اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں...... ($\frac{9}{71}$)"۔

دوسری جگہ فرمایا :-

> "تمہارے دوست تو صرف اللہ۔۔ اس کا رسولؐ اور ایماندار لوگ ہیں۔ جو نماز کی پابندی کرتے ہیں۔ زکوٰۃ دیتے ہیں اور ان میں خشوع ہوتا ہے۔" ($\frac{5}{55}$)

ان آیات میں حصر کے ساتھ بیان فرما دیا کہ موالات کے تعلقات صرف مسلمانوں کے ساتھ پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ پھر اسی پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اس کے برعکس یہ بھی بالتصریح فرما دیا کہ غیر مسلموں کے ساتھ ہرگز ہرگز اس قسم کے تعلقات پیدا نہیں کیے جا سکتے۔ ارشاد ہے :-

> "اے ایمان والو! اپنوں کے سوا اور کسی کو دوست (ولی) مت بناؤ۔ وہ لوگ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ وہ تمہاری ضرر رسانی کی تمنائیں رکھتے ہیں۔ بغض و عناد بسا اوقات ان کے منہ سے ظاہر ہو جاتے ہیں۔ لیکن جس قدر ان کے دل میں چھپا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ہم آیات تمہارے سامنے ظاہر کر چکے ہیں اگر تم سمجھنے والے ہو۔ تم ان لوگوں سے محبت کرتے ہو مگر وہ کبھی تم سے محبت نہیں کرتے، حالانکہ تم تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہو۔ جب یہ تم سے ملتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم بھی ان باتوں کو مانتے ہیں اور جب تم سے الگ ہوتے ہیں تو تمہارے خلاف غصے سے اپنی انگلیاں کاٹ کاٹ کر کھاتے ہیں۔ کہہ دیجئے کہ جاؤ اپنے غصے میں مر مٹو اللہ دلوں کے حال سے باخبر ہے۔ اگر تمہیں کوئی اچھی بات پہنچ جائے تو ان کے لیے موجب غم ہوتی ہے اور اگر تم پر کوئی مصیبت آ جائے تو یہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔ اگر تم استقلال سے رہو اور ان سے اپنی

حفاظت کرتے رہو تو ان لوگوں کی تدابیر تم کو ذرا بھی ضرر نہیں پہنچا سکیں گی۔ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو محیط ہے۔" (۳/۱۱۹-۱۱۷)

ہم صرف اتنا دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ آیات آج بھی قرآن مجید میں موجود ہیں یا (نعوذ باللہ) منسوخ ہو چکی ہیں۔ اگر موجود ہیں تو کیا ہندوستان کا ہندو ان غیر مسلموں میں شامل ہے یا نہیں جن کی نفسیاتی کیفیت کا ذکر ان آیات میں موجود ہے اور اگر ہندو ان میں شامل ہے تو کیا اس کے ساتھ موالات کے تعلقات پیدا کیے جا سکتے ہیں؟ اس کا جواب بھی خود قرآن کریم سے سن لیجئے۔ فرمایا:۔

"جو لوگ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں ان کو تم کبھی نہ دیکھو گے کہ وہ ایسے لوگوں سے دوستی رکھتے ہوں جو اللہ اور ..... رسول کے خلاف ہوں۔ خواہ گروہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا کنبہ کے لوگ ہی کیوں نہ ہوں۔" (۵۸/۲۲)

یعنی وطن کا رشتہ تو ایک طرف یہاں خون کا رشتہ بھی کوئی قیمت نہیں رکھتا۔

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق پچھلے باب میں لکھا جا چکا ہے کہ انہوں نے کس قدر واضح الفاظ میں اعلان فرما دیا کہ غیر مسلم جبتک ایمان لا کر جماعت مومنین میں داخل نہ ہو جائیں ان کے ساتھ موالات کے تعلقات پیدا نہیں ہو سکتے..... اس اعلان سے متصل یہ آیات بھی ملاحظہ ہوں۔ فرمایا:۔

"اے ایمان والو! تم میرے دشمن اور اپنے دشمن کو دوست مت بناؤ کہ ان سے دوستی کا اظہار کرنے لگ جاؤ۔ حالانکہ تمہارے ساتھ جو کچھ حق کے ساتھ آچکا ہے وہ اس کے منکر ہیں..... اگر ان کو تم پر دسترس حاصل ہو جائے تو فوراً تمہارے دشمن ہو جائیں گے اور تم پر زبان اور ہاتھ سے مضرت رسانی پر اتر آئیں گے۔" (۶۰/۱-۲)

واضح رہے کہ ان ارشادات خداوندی میں کسی خاص زمانہ۔ کسی خاص ملک یا کسی خاص قوم کے غیر مسلموں کا ذکر نہیں۔ بلکہ یہ تمام کفار کو محیط ہیں۔ قرآن کریم میں اس بات کی صراحت متعدد مقامات پر موجود ہے جس کے ..... یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اگر کسی کو اس میں کلام ہو تو ہم اس کی تصریحات پیش کرنے کو بھی تیار ہیں۔ قرآن کریم نے مسلمانوں کو کفار کے موالات سے جو اتنی شدت سے روکا ہے تو اس کی وجہ بھی بیان فرما دی ہے کہ:۔

ودوا لو تکفرون کما کفروا۔ فتکونون سواء۔ فلا تتخذوا منھم اولیاء (۴/۸۹)

وہ لوگ اس تمنا میں ہیں کہ جیسے خود ہیں اسی قسم کے تمہیں بنا لیں۔ تاکہ تم اور وہ سب برابر ہو جاؤ۔ پس ان میں سے کسی کو دوست نہ بنانا۔

اس میں یہ ٹکڑا "فتکونون سواء" قابل غور ہے۔ یعنی ان کی خواہش یہ ہے کہ وہ تم کو بھی اپنے جیسا بنا لیں اور یوں تم سب برابر ہو جاؤ۔ ایک جیسے ہو جاؤ۔ ذرا غور کیجئے کیا متحدہ قومیت کی بنیاد یہی اس اصول پر نہیں ہے کہ ہندو اور مسلمان برابر ہو جائیں۔ ایک قوم بن جائیں۔ اقلیتیں اپنے امتیازی نشانات چھوڑ کر متحدہ قومیت کے اجزا بن جائیں حالانکہ مسلمان کا امتیازی نشان ہی اس میں ہے کہ وہ صرف خدا کے رنگ میں رنگا ہو۔ صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ (اللہ کا رنگ اور اللہ کے رنگ سے بہتر کونسا رنگ ہو سکتا ہے۔) اور یہ رنگ اسی وقت تک قائم رہ سکتا ہے جبتک مسلمانوں کی جماعتی زندگی کا وجود قائم ہے۔ جب یہ امتیازی وجود مٹ جائے گا تو یہ رنگ بھی باقی نہیں رہے گا۔

غیر ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے۔ فرمایا:-

یا ایها الذین آمنوا۔ ان تتقوا اللّٰہ یجعل لکم فرقانا (۸/۲۹)

اے ایمان والو۔ اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو وہ تمہیں ایک امتیازی زندگی عطا کرے گا۔

یہ امتیاز مٹ گیا تو مسلمان بھی باقی نہ رہا اور "فتکونون سواءً" سے کفار کی خواہش ہی یہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح یہ امتیاز مٹ جائے اور اس کے مٹانے کے لیے آج ہندوستان میں سب سے بڑا حربہ متحدہ قومیت کا تصور ہے جسے مولانا صاحب عین اسلامی شعار بتا رہے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ ؎

درصفِ شمنرا برخود کشادی!　　　دو گامے رفتی و از پا فتادی

برہمن از بتاں طاقِ خود آراست　　　تو قرآں را سرِ طاقے نہادی! (اقبالؔ)

تعلقات کی دوسری قسم

تعلقات کی دوسری قسم یہ ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ باہمی عہد و پیمان کرے۔ معاہدہ اور میثاق کی رُو سے مشروط و مذکور معاملات میں ایک دوسرے کی مدد کا وعدہ کرے۔ یہ وہ طریق ہے جس کی قرآن کریم اجازت دیتا ہے اور یہی وہ طریق ہے جس کی رُو سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو سکتا ہے۔ ایسا ہی اتحاد نبی اکرمؐ نے مدینہ کے یہود کے ساتھ پیدا کیا تھا۔ قرآن کریم نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ کفار اپنے عہد و پیمان پر بھی بہت کم پابند رہیں گے۔ اس لیے کہ ایک مسلمان تو اس لیے معاہدہ کی پابندی ضروری سمجھتا ہے کہ یہ اس کے خدا کا حکم ہے۔ ایسا نہ کرنے سے وہ خدا کے ہاں مجرم قرار پائے گا۔ اس کے برعکس کفار معاہدہ کو محض ایک سیاسی چال سمجھتے ہیں۔ یونان کے ایک بہت بڑے مقنن سولن کا یہ قول کسے یاد نہیں کہ "معاہدہ مکڑی کا جالا ہے جو اپنے سے کمزور کو پھنسا لیتا ہے لیکن اپنے سے طاقتور کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔" اور آج کون ہے جو سیاستِ عالم کا مطالعہ کرے اور اس مقولہ کی تصدیق نہ کرے۔ اس لیے قرآن کریم نے یہ بھی فرما دیا کہ غیر مسلموں کے ساتھ عہد و پیمان کرنے کے بعد اقوام کی نیند نہ سو جاؤ۔ بلکہ اپنی جمعیت اور طاقت کو ہمیشہ برقرار رکھو کہ عہد بھی انہیں قوموں سے استوار رہتے ہیں جن میں طاقت موجود ہوتی ہے مسلمان اس طاقت کو عہد شکنی میں یا کمزوروں کو کچلنے میں صرف نہیں کرے گا بلکہ اسے اس لیے برقرار رکھے گا کہ:-

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

اس کے بغیر ہر بالادست قوت اسے ہڑپ کرنے کی فکر میں رہے گی۔ اسی لیے فرمایا:-

وَاَعِدُّوا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ (۸/۶۰)

اور ان کے خلاف ہر ممکن قوت کے ساتھ اور پلے ہوئے گھوڑوں سے اپنے آپ کو تیار رکھو تاکہ اس سے اللہ کے اور تمہارے دشمن خوف کھائیں اور ان کے علاوہ دوسرے لوگ بھی۔

قومیت پرست حضرات یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ فرض کیجئے ہم ہندوؤں کے ساتھ آج معاہدہ بھی کر لیں تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ معاہدہ کی پابندی ضرور کریں گے۔ لیکن وہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ معاہدہ سے مطلب یہ نہیں کہ ایک کاغذ پر دستخط کر کے پھر بے فکر ہو جانا چاہیئے۔ ہندوستان میں مسلمان کچھ کم حیثیت نہیں رکھتے۔ نو کروڑ نفوس اگر اپنے اندر اجتماعیت کا جذبہ پیدا کر کے ایک

نظام اور ایک مرکز کے ماتحت زندگی بسر کرنے کا تہیہ کر لیں تو ہندو تو ایک طرف انگریز کی بھی مجال نہیں کہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکے۔ اس وقت دیکھئے کہ معاہدوں کی توقیر کس طرح نہیں ہوتی۔ یہی تو وہ خطرہ ہے جس کے لیے ہندو مسلمانوں کی الگ جاعتی زندگی کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتا۔ اور اس کے خلاف اس نے متحدہ قومیت کا ایسا نظر فریب جال تیار کیا ہے جس میں بڑے بڑے مریخ زیرک دشمنہ بر بالنظر آتے ہیں۔ ورنہ کفار پر اعتماد۔ ان سے دلی دوستی۔ اُن کے وعدوں کا اعتبار۔ ان سے یگانگت کے تعلقات مسلمانوں کی اجتماعی خودکشی کے مرادف ہے۔

سطور بالا میں ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ کتاب و سنت کی روشنی میں بیان کیا ہے۔ لیکن ہمارے قومیت پرست حضرات کی یہ عادت ہو چکی ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کی کوئی بات صحیح تسلیم نہیں کرتے جو ان سے اختلاف رائے رکھتا ہو۔ خواہ وہ قرآن ہی پڑھ کر کیوں نہ سنائے۔ اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ اس باب میں انہی کی ایک جلیل القدر ہستی کے خیالات پیش کر دیئے جائیں جنہیں وہ اپنے مسلک قومیت پرستی سے پہلے اپنی پوری شان خطابت کے ساتھ مسلمانوں کے لیے واحد اسلامی راہ عمل قرار دیا کرتے تھے۔ سنئے اور غور سے سنئے کہ مولانا ابو الکلام آزاد جو کہ اب ان قومیت پرستی کے سرخیل ہیں کیا ارشاد فرماتے ہیں۔

مولانا آزاد کے ارشادات (مسلک قومیت پرستی سے پہلے)

"کفار کے عہد و پیمان کا نہیں بارہا تجربہ ہو چکا ہے۔ وہ آبرو باختہ ہیں۔ عزت نفس و شرف کا انہیں لحاظ نہیں۔ وہ قسمیں کھاتے ہیں۔ حلف اٹھاتے ہیں کہ یہ وعدہ استوار ہے اس میں دوام و استمرار ہے۔ یہ عہد محکم ہے۔ یہ قول و قرار قانونی حیثیت رکھتا ہے۔ زبان سے سب کچھ کہتے ہیں۔ مگر ان قسموں سے کام لینے کے وقت کچھ یاد نہیں رکھتے ایسے لوگوں کے مطیع رہنا ذلت کی بات ہے۔ اسلام اپنے فرزندوں کو ان کی اطاعت سے باز رہنے کی ہدایت کر رہا ہے کہ خبردار یہ قسمیں کھانے والے ذلیل النفس ہیں۔ ان کے حلف پر نہ جانا یہ ادھر کی بات اُدھر لگاتے ہیں۔ قوم میں تفرقے پیدا کرتے ہیں۔ منع خیر کے لیے نہایت مبالغہ کے ساتھ آمادہ رہتے ہیں۔ حد سے بڑھ جاتے ہیں۔ فتنہ گری ان کا شیوہ ہے۔ تلوُّن ان کی عادت ہے۔ ...... کفار سے مسلمانوں کو ساز باز نہ رکھنا چاہیئے۔ اُن سے بے تعلقی لازم ہے۔ جو ساز باز رکھتے ہیں جنہیں ان سے بے تعلق رہنے میں اپنے اور اپنی قوم کیلئے مشکلات اور مصائب کا اندیشہ ہے۔ وہ غلطی پر ہیں۔ ان کو پشیمان ہونا پڑے گا۔ اسلام کو فتح نصیب ہوگی اور مسلمانوں کی بہبود و بہتری کا قدرت کاملہ کوئی اور انتظام کرے گی۔"

(مضامین آزاد حصہ سوم)

خدا معلوم وہ قرآن اب کہاں چلا گیا جو ان حضرات کو کفار کے متعلق اس قسم کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ اُس بصیرت ایمانی کو کن بیڑوں کی چمک چکا چوند کر گئی جو ان حقائق کو بے نقاب دیکھا کرتی تھیں۔ اس جرأت ایمانی کو کس کی نظر کھا گئی جو سینے کے پورے زور سے کفار سے برات و بیزاری کا اعلان کیا کرتی تھی۔ وہ حرارت قلبی کونسی مصلحت کوشیوں کی برفانی سلوں کے نیچے دب گئی جو کفار کی سازشوں پر یوں مشتعل ہو جایا کرتی تھی۔ اس قدرت کاملہ پر بے پناہ توکل کو کیا ہو گیا جو کبھی یہ تسکین دیا کرتا تھا کہ کفار کی کثرت سے گھبرا کر ان کے ساتھ تعلقات بڑھانے پر آمادہ نہ ہو جاؤ۔ اسلام کی کامیابی کے لیے خدا خود کوئی انتظام کرے گا۔ ایسے قوم کی بدبختی نہ کہئے تو کیا کہیئے کہ یہ حضرات جو کبھی اپنے صحیح اسلامی مسلک کی بنا پر قوم کی نگاہوں میں ممتاز ہ

مقدس قرار پا گئے تھے۔ اپنی اس پوزیشن سے یوں ناجائز فائدہ اٹھا کر اب قوم کو اپنے ہاتھوں جہنم میں دھکیل رہے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۝ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا ۭ وَبِئْسَ الْقَرَارُ (۱۴ - ۲۸ - ۲۹)

کیا تم نے ان لوگوں کی طرف بھی دیکھا جنہوں نے کفرانِ نعمتِ الٰہی کیا اور یوں اپنی قوم کو جہنم میں دھکیل دیا۔ جس میں وہ داخل ہوں گے اور جو بہت بُری جگہ رہنے کی ہے۔

باب پنجم

متحدہ قومیت کے دعوے کے اثبات میں مولانا صاحب نے صرف یہی دو دلیلیں پیش کی ہیں جن کا جواب عرض کیا جا چکا ہے لیکن ان کے رسالہ میں چند ایک باتیں اور بھی ایسی ہیں جو ان کی غلط فہمیوں کی آئینہ دار ہیں اور جن کا ازالہ ضروری نظر آتا ہے۔

اسلام میں لچک نہیں

حضرتِ علامہؒ نے اپنے بیان میں فرمایا تھا کہ :۔

"مولانا حسین احمد صاحب سے بہتر اس بات کو کون جانتا ہے کہ اسلام ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا۔"

اس کے متعلق مولانا صاحب رقم طراز ہیں :۔

"یہ خیال کہ اسلام بالکل غیر لچکدار مذہب ہے میری سمجھ سے باہر ہے۔ میں جہاں تک اس کے قوانین کا تتبع کرتا ہوں وہ غیر مسلموں کے ساتھ ایک ملک میں رہ سکتا ہے۔ ان کے ساتھ صلح کر سکتا ہے۔ ان کے ساتھ مواعدے کر سکتا ہے۔ ان کے ساتھ معاملات خرید و فروخت، شرکت و اجارہ، ہبہ و عاریت قرض و امانت وغیرہ وغیرہ کر سکتا ہے۔ وہ ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا۔ چلنا پھرنا۔ شادی و غمی میں شریک ہونا۔ کھانا پینا وغیرہ وغیرہ کر سکتا ہے۔ یہود و نصاریٰ کی لڑکیوں سے نکاح کر سکتا ہے۔" (متحدہ قومیت اور اسلام ص۵۸)

اس جواب کو پڑھئے اور پھر غور فرمائیے کہ ہم نے جو عرض کیا ہے کہ مولانا صاحب شاید سمجھے ہی نہیں کہ حضرتِ علامہؒ نے کیا لکھا تھا۔ وہ حرف حرف صحیح ہے یا نہیں ——— حضرتِ علامہؒ نے لکھا تھا کہ اسلام ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اس کا مطلب صاف ہے کہ وہ اصول جس پر اسلام نوعِ انسانی کی تشکیل ایک نظامِ اجتماعی میں کرنا چاہتا ہے وہ قوانینِ فطرت کی طرح اٹل اور بے لچک ہے۔ وہ اصول جیسا کہ ابھی ابھی لکھا جا چکا ہے یہ ہے کہ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کے تمام ایسے نظام جو انسانوں نے وضع کیے ہیں، خلافِ فطرت اور خلافِ منشاءِ ایزدی ہیں۔ یعنی رنگ، نسل، وطن، زبان وغیرہ کے اشتراک سے نظامِ اجتماعی قائم کرنا۔ اس کے خلاف وہ ان تمام حدود و ثغور سے بلند ہو کر وحدتِ قومی کے لیے وحدتِ ایمان کو بنیاد قرار دیتا ہے۔ یہ وہ اصول ہے جس میں کوئی لچک نہیں۔ فرمائیے اس چیز کو اس سے کیا تعلق کہ مسلم و غیر مسلم کا اٹھنا بیٹھنا۔ کھانا پینا۔ شادی غمی میں شریک ہونا جائز ہے۔ حیرت ہے کہ مولانا صاحب جیسی ہستی کہ جن کے علم و فضل کا شہرہ بامِ ثریا تک پہنچا ہوا ہے، اتنا بھی نہیں سمجھ سکے کہ

ہیئتِ اجتماعیہ کے اصول اور اکٹھے چلنے پھرنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اور وہ فرق یہ ہے کہ باہمی اُٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے سے مسلم و غیر مسلم کی ایک متحدہ قومیت نہیں بن جائے گی۔ یہ اٹھنا بیٹھنا۔ کھانا پینا۔ عام معاشرتی آداب کی باتیں ہیں۔ جن میں اسلام واقعی اپنے اندر لچک رکھتا ہے۔ لیکن وہ بھی صرف اس وقت تک کہ یہ چیزیں اسلام کے کسی اصول سے نہ ٹکرائیں۔ مثلاً آپ فرماتے ہیں کہ مسلمان غیر مسلمان کا کھانا کھا سکتا ہے، یہ لچک ہوئی۔ لیکن اگر وہ کھانا بغیر خدا کے نام پر منسوب ہو تو خواہ ظاہری شکل میں کتنا ہی پاکیزہ اور صاف ستھرا کیوں نہ ہو اُسے ایک مسلمان نہیں کھا سکے گا۔ یہ وہ اصول آ گیا، جہاں لچک ختم ہو گئی۔ اسی طرح مثلاً مسلمان۔ یہود و نصاریٰ کی لڑکیوں سے شادی کر سکتا ہے۔ لیکن ایک مشرکہ سے شادی نہیں کر سکتا۔ یہاں پہنچ کر وہ لچک ختم ہو گئی۔ اسی طرح مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ معاملات کر سکتا ہے۔ لین دین کر سکتا ہے۔ معاہدے کر سکتا ہے۔ لیکن ان کے ساتھ مل کر ایک متحدہ قوم نہیں بن سکتا۔ یہاں پہنچ کر اسلام کی لچک ختم ہو جائے گی۔ یہ ہے مطلب حضرت علامہ کے اس فقرہ کا کہ اسلام ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے اصول میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا۔

مذہب کا صحیح مفہوم

حضرت علامہؒ نے فرمایا تھا کہ یہ نظریۂ قومیت جسے مولانا صاحب نے پیش کیا ہے۔ یورپ کا وضع کردہ ہے اور اس کے جہنمی نتائج آج دنیا کے سامنے ہیں۔ اس کے جواب میں مولانا صاحب ارشاد فرماتے ہیں:۔

"ممکن ہے کہ یورپ نے وطنیت اور قومیت کو کسی خاص مفہوم اور کسی خاص ہیئتِ اجتماعیہ کے لیے استعمال کیا ہو اور اس پردہ کا مزن ہو رہے ہوں۔ اور ان مقاصد اور نصب العین کو اپنے اپنے مذہبی اداروں کے مخالف پا کر مذہب کو سلام کر بیٹھے ہوں یا مذہب کو صرف پرائیویٹ زندگی شمار کرنے لگے ہوں۔ مگر کیا یہ ضروری ہے کہ ہمارا اقدام متحدہ قومیت یا وطنیت کی طرف صرف انہی کیفیات اور لوازم کے ساتھ ہو جو کہ ان کے یہاں ملحوظ ہو رہے ہیں"۔ (متحدہ قومیت اور اسلام ص۵۹)

مذہب کے متعلق ہم گزشتہ صفحات میں لکھ چکے ہیں کہ قومیت پرست حضرات کے نزدیک مذہب صرف ایک پرائیویٹ عقیدہ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور اسی قسم کے مذہب کی آزادی کی وہ اجازت دے سکتے ہیں۔ وہ مذہب جو مسلمانوں کے تمام شعبہ ہائے زندگی کو محیط ہو۔ جو ان کے معاشی۔ معاشرتی۔ اقتصادی۔ عمرانی۔ تمدنی۔ سیاسی۔ دینی۔ دنیاوی تمام امور پر حاوی ہو اور جسدِ انسانیت میں بمنزلہ روح کے کام کر رہا ہو۔ قومیت پرست حضرات کے نزدیک ترقی کا دشمن اور متحدہ قومیت کے راستہ میں ایک خطرناک چٹان ہے۔ اسی لیے پنڈت جواہر لال نہرو دانت پیستے ہیں کہ اس قسم کا مذہب اور ایسے مذہب کے مدعی ابھی تک زندہ کیوں ہیں! اس کے باوجود مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ ہمارا اقدام متحدہ قومیت یا وطنیت کی طرف ان کیفیات کے ساتھ نہیں اٹھ رہا جو مذہب کو ایک پرائیویٹ عقیدہ کی حیثیت دیتی ہیں۔ یہاں پہنچ کر تو ہمیں شبہ ہونے لگ گیا ہے کہ جہاں مولانا صاحب

حـ "ممکن ہے" سے ظاہر ہے کہ مولانا صاحب کو یقینی طور پر اس کا بھی علم نہیں کہ یورپ وطنیت اور قومیت کو کسی خاص مفہوم اور خاص ہیئت اجتماعیہ کے لیے استعمال کرتا ہے۔ حالانکہ علامہ اقبالؒ کے ساتھ اس بحث کا نقطۂ ماسکہ ہی یہی تھا۔ (طلوع اسلام)

کی نگاہ قرآنی سیاست پر نہیں ہے وہاں وہ ملکی سیاست سے بھی بہت کم واقف ہیں۔ ورنہ یہ حقیقت کس سے پوشیدہ ہے کہ متحدہ قومیت بنتی ہی اُس وقت ہے جب یا تو مذہب ایک ہو۔ یا مذہب کو محض ایک پرائیویٹ عقیدہ کی حیثیت دیدی جائے۔ اس کے سوائے متحدہ قومیت کی تشکیل ہو ہی نہیں سکتی۔ اصل یہ ہے کہ مولانا صاحب اور ان کے ہم مشرب حضرات کا مذہب کے متعلق تصور ہی جداگانہ ہے اور یہ وہ تصوّر ہے جسے ایک عرصہ سے مسلمانوں کے سامنے صحیح اسلام بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ تصور کیا ہے؟ اسلام کے پانچ ارکان۔ کلمہ، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج۔ اگر کوئی اذان دینے میں مزاحمت نہ کرے۔ نماز پڑھنے کی کسی جگہ ممانعت نہ ہو۔ روزے بلا روک ٹوک رکھے جا سکیں۔ زکوٰۃ کا روپیہ اپنی اپنی مرضی کے مطابق بھیجا جا سکے اور حج کرنے کے لیے پاسپورٹ پر کوئی پابندی نہ ہو تو یہ حضرات اسے عین مذہبی آزادی قرار دیتے ہیں۔ ان حضرات کے نزدیک مذہب اسی چار دیواری کے اندر گھرا ہوا ہے۔ ان ارکان کی تکمیل سے اسلام کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ اس سے زیادہ اسلام کسی چیز کا مطالبہ نہیں کرتا۔ زیادہ سے زیادہ کھانے پینے یا شادی بیاہ کے معاملات میں کچھ پابندیاں عائد کرتا ہے۔ اسی لیے یہ حضرات اس دلیل کو نہایت بلند آہنگی سے پیش کرتے ہیں کہ دیکھو کانگرس نے کراچی کے ریزولیوشن میں مذہبی آزادی کے اصول کو تسلیم کر لیا ہے۔ وہ اقلیتوں کے مذہب کی حفاظت کی ضمانت دیتی ہے۔ بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھتے ہیں تو ارشاد فرماتے ہیں کہ:-

"کانگریس میں ہمیشہ ایسی تجاویز آتی اور پاس ہوتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے مذہب اسلام کے تحفظ اور وقار کو ٹھیس نہ لگے۔" (متحدہ قومیت اور اسلام صـ۶۱)

حتیٰ کہ پنڈت جواہر لال نہرو جیسے خدا کے منکر کے متعلق فرماتے ہیں کہ:-

"جواہر لال ہندو ہے اس نے کبھی نہیں کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ اس کے باوجود وہ مسلمانوں کا تحفظ چاہتا ہے۔" صـ (تقریر مولانا حسین احمد صاحب مطبوعہ زمزم۔ ۷ جولائی ۱۹۳۸ء)

ان امور سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک مذہب کا وہی مفہوم ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ یعنی "پانچ ارکانِ اسلام اور ان سے متعلقہ مسائل" اس سے آگے "دنیاداری" کی حدود شروع ہو جاتی ہیں اور ان امور کے لیے جس قسم کا نظام ملک میں قائم ہو جائے وہ ان کے نزدیک "از روئے شریعت" جائز اور درست ہو سکتا ہے۔ اسی لیے مولانا صاحب کا فتویٰ ہے (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) کہ ایسی جمہوریت جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، عیسائی شامل ہوں۔ عین اسلام کے مطابق ہے۔ یہ فتویٰ جس سے فکرِ اسلامی کی ایک ایک اینٹ گر جاتی ہے محض اس بنا پر اس جرأت و بیباکی سے دیدیا گیا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک مذہب کا دائرہ صرف پانچ ارکانِ اسلامی تک محدود ہے۔ جب ان میں عدم مداخلت کی ضمانت مل جائے تو امورِ دنیاوی کے لیے جمہوریت سے بڑھ کر اور کونسا نظام بہتر ہو سکتا ہے۔ لیکن انھیں کس طرح سمجھایا جائے کہ اس قسم کی جمہوریت جس میں اکثریت غیر مسلموں کی ہو۔ مسلمانوں کے لیے غلامی کی بدترین لعنت ہے۔ مسلمانوں کے باہمی امور کے فیصلوں کے لیے قرآن کریم نے ایک الگ اور جداگانہ نظام قائم کیا ہے جس کی بنیادی اینٹ یہ ہے کہ فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم۔

صـ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ لا یالونکم خبالا۔ غیر مسلم تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ وداما عنتم جس بات سے تمہیں ضرر پہنچے وہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔

(تیرے رب کی قسم یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے اختلافی معاملات میں تمہیں اپنا حکم نہ بنائیں) اور نبی اکرمؐ سے ارشاد تھا کہ وشاورھم فی الامر (معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرو) اسی کو دوسری جگہ ان الفاظ میں دہرایا ہے کہ وامرھم شوریٰ بینھم (ان کے معاملات میں باہمی مشاورت سے طے پائیں گے) جس سے ظاہر ہے کہ اس مجلس مشاورت میں کسی غیر مسلم کا دخل نہ ہوگا۔ اور اس کا صدر خود مسلمانوں کا امیر ملت۔ مرکزِ دین ہوگا۔ چہ جائیکہ وہ نظام جمہوریت ایسا ہو جس میں اکثریت غیر مسلموں کی ہو۔ ایسی اکثریت کے فیصلوں کے متعلق تو قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ:-

"کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا فیصلہ کرنے والا (حکم) تسلیم کر لوں۔ حالانکہ اس نے تمہاری طرف مفصل کتاب نازل کر دی ہے ..... اور یوں تیرے رب کے کلمات صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے ہیں۔ ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اور وہ سمیع و علیم ہے۔"

• اور اگر تو زمین پر بسنے والوں کی اکثریت کی اطاعت کرے تو وہ تجھے اللہ کے راستے سے گمراہ کر دیں وہ تو صرف ظن (و قیاس) کی اتباع کرتے ہیں اور یونہی اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔ (۶/۱۱۵-۱۱۶)

ان آیاتِ مقدسہ کے معانی کی تفصیل طویل ہے۔ لیکن اربابِ نظر سے ان کا مفہوم پوشیدہ نہیں ہوگا۔ اسلام کا نظام اجتماعی یہ ہے کہ تمام معاملات کے فیصلوں کے لیے کتاب اللہ بہ حیثیت اصولِ قانون قیامت تک کے لیے موجود ہے۔ اس قانون کو نافذ کرنے کے لیے امامتِ کبریٰ کے مرکزِ اولین جناب نبی اکرمؐ مبعوث ہوئے۔ ان کے بعد یہ منصب امامت حضورؐ کے جانشینوں کی طرف منتقل ہو گیا۔ لہٰذا آج مسلمانوں کے لیے اسلامی نظام زندگی یہ ہوگا کہ ان کی اپنی جماعت ہو۔ اس جماعت کے منتخب افراد پر مشتمل ایک مجلس مشاورت ہو اور ان میں اتقیٰ۔ سب سے زیادہ متقی ان کا امیر ہو۔ اور مسلمانوں کے تمام امور اس نظام کے ماتحت سرانجام پائیں۔ ایسے نظام کے بغیر محض نماز۔ روزہ سے جس قسم کا اسلام باقی رہتا ہے۔ اس کے متعلق ہم سے نہیں بلکہ ایک قومیت پرست عالم دین کی زبانی سنیئے۔ مولانا آزاد ہیئتِ اجتماعیہ اسلامیہ کی بحث کے دوران لکھتے ہیں۔۔۔

(لیکن قومیت پرستی کے زمانہ سے پیشتر)

"احادیث صحیحہ سے اس کی مزید توضیح ہوتی ہے، اس بارہ میں اس کثرت کے ساتھ حدیثیں موجود ہیں اور عہد صحابہؓ سے لے کر عہدِ تدوین کتب تک مختلف طبقات رواۃ حفاظ میں اس قدر ان کی شہرت رہ چکی ہے کہ اسلام کے عقیدہ توحید و رسالت کے بعد شاید ہی کوئی چیز اس درجہ تواتر و یقین تک نہیں پہنچی ہوگی۔ سب سے پہلے میں مسند امام احمد وغیرہ کی ایک روایت نقل کروں گا جس میں بالترتیب اسلام کا نظام عمل بیان کیا گیا ہے۔"

قال صلعم۔ انا آمرکم بخمس اللہ امرنی بھن۔ الجماعۃ۔ والسمع والطاعۃ والھجرۃ والجھاد فی سبیل اللہ۔ انہ من خرج من الجماعۃ قید شبر فقد خلع ربقۃ الاسلام من عنقہ الا ان یراجع۔ ومن دعا بدعوی جاھلیۃ۔ فھو من جثی جہنم قالو یا رسول اللہ وان صام وان صلی۔ قال وان صلی وصام وزعم وانہ مسلم۔

یعنی فرمایا۔ تم کو پانچ باتوں کے لیے حکم دیتا ہوں۔ جن کا حکم اللہ نے مجھے دیا ہے۔ جماعت۔ سمع طاعت۔ ہجرت اور اللہ کی راہ میں جہاد۔ یقین کرو کہ جو مسلمان جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہوا تو اس نے اسلام کا حلقہ

اپنی گردن سے نکال دیا اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی کی جگہ جاہلیت کی بے قیدی کی طرف بلایا تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ (حضور) کیا ایسا شخص جہنمی ہوگا۔ خواہ وہ روزہ رکھتا ہو۔ نماز پڑھتا ہو۔ فرمایا ہاں۔ اگر یہ نماز پڑھتا ہو۔ روزہ رکھتا ہو۔ اور بزعم خویش اپنے آپ کو مسلمان ہی کیوں نہ سمجھتا ہو۔ پہلی چیز جماعت ہے۔ یعنی تمام اُمت کو ایک خلیفہ و امام پر جمع ہو کر اور اپنے مرکز قومی سے جڑ کر رہنا چاہیئے الگ الگ نہیں رہنا چاہیئے۔ آگے چل کر شہرت کے ساتھ ایسی حدیثیں ملیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ جماعت سے الگ ہو کر رہنے کو یا ایسی منتشر زندگی کو جو ایک بندھی ہوئی جماعت کی شکل نہ رکھتی اور کسی امیر کے تابع نہ ہو۔ اسلام نے غیر اسلامی اور ابلیسی راہ قرار دیا ہے۔ انفرادی زندگی کو وہ زندگی ہی نہیں مانتا۔ اسلامی زندگی جماعت ہے۔" (الخلافۃ والجزیرۃ العرب۔ مولانا ابوالکلام آزاد)

اور اسی بنا پر مولانا آزاد نے کبھی فرمایا تھا کہ:۔

"مسلمانوں کی قومیت صلوٰۃ کا مدار صرف شریعت ہے۔" (خطبۂ صدارت لاہور)

ان امور سے آپ اندازہ فرمالیجئے کہ کانگرس جس قسم کی مذہبی آزادی کی ضمانت دیتی ہے وہ مذہب ایک پرائیویٹ عقیدہ میں سمٹ کر رہ جاتا ہے یا اس سے کچھ زیادہ بھی رہتا ہے؟ اس سے آگے بڑھنے والا مذہب تو مسلمانوں کے اپنے الگ نظام اور اپنی الگ جماعت کے قیام کا مقتضی ہو جاتا ہے اور یہ وہ باتیں ہیں جو انتہائی "فرقہ پرستی" پر دلالت کرتی ہیں۔ لہٰذا "قومیت پرستی" انھیں کس طرح اپنے دستور العمل میں جگہ دے سکتی ہے۔ ہم مولانا صاحب کو کس طرح سمجھائیں کہ اسلام تو ایمان اور اعمال صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض مسلمانوں کی اپنی حکومت و سلطنت قرار دیتا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ

"اللہ نے تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور وہ اعمالِ صالحہ کرتے ہیں۔ یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ انھیں اس دنیا کی حکومت عطا فرمائے گا۔"

ذرا کانگرس سے کہیئے کہ اس قسم کے مذہب کی آزادی کی ضمانت دیدے جو مسلمانوں کی اپنی حکومت کے قیام کی طرف مخبر ہو۔ پھر دیکھئے کہ کانگرس کی طرف سے کیا جواب ملتا ہے اور جو مذہب مسلمانوں کو ان کی اپنی حکومت کے قیام کی طرف نہیں لے جاتا، وہ ایک پرائیویٹ عقیدہ سے آگے نہیں بڑھتا۔ اس قسم کے مذہب کی آج بھی آزادی حاصل ہے، اور اسی قسم کے مذہب کی آزادی کی ضمانت کانگرس کے ریزولیوشن دیتے ہیں، جس پر مولانا صاحب اور ان کے ہم مسلک حضرات یوں شاداں و فرحاں پھرتے ہیں۔ سچ فرمایا تھا حضرت علامہ نے کہ ؎

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدہ کی اجازت ناداں سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

غیر اسلامی نظام

حضرت علامہ نے فرمایا تھا کہ "ہر وہ دستور العمل جو غیر اسلامی ہو نامعقول و مردود ہے"۔ اس کے متعلق مولانا صاحب فرماتے ہیں:۔

"اسی طرح یہ کہنا کہ "نظام اسلامی" اور اس کا کاربند کسی دوسرے نظام کے ساتھ شریک ہی نہیں ہو سکتا۔

غیر قابلِ قبول امر ہے۔ قوانینِ اسلامیہ اور احکامِ شرعیہ نے اگرچہ بہت سے اُمور میں کوئی نہ کوئی تجویز قائم کر دی ہے۔ مگر بے شمار امور کو زیرِ اباحت و اجازت رکھا ہے۔ جن میں ہم کو اختیار ہے کہ اپنی صوابدید کے مطابق عمل کریں۔ ان ہی امور میں بادشاہیں اور ان کے حکام اور انجمنیں وغیرہ اپنے اپنے آراء و احوال کو کام میں لاتی رہتی ہیں۔" (متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ ۶۳)

یہاں پھر وہی بنیادی غلط فہمی اُلجھاؤ کا باعث بن رہی ہے۔ حضرت! دستور العمل اور نظام سے مراد وہ اصولِ حیات ہیں جو اسلام نے اپنے متبعین کے لیے تجویز فرمائے ہیں اور جو قوانینِ فطرت کی طرح اٹل ہیں۔ لا تبدیل لکلمات اللہ۔ اور آپ جن چیزوں کی اجازت و اباحت کا ذکر فرما رہے ہیں وہ ان اصول کی فروعات و جزئیات ہیں۔ مسلمانوں کی الگ اجتماعی زندگی کا قیام و وجود اصولِ اسلام میں سے ہے۔ جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ البتہ قومی اور اجتماعی حیثیت سے دوسری قوموں کے ساتھ اشتراکِ عمل اور اس کا طریقِ کار فرعی چیزیں ہیں جنہیں اسلامی جماعت اپنے اپنے زمانہ کے مخصوص حالات کے ماتحت خود مرتب کر سکتی ہے۔ فرع اور اصول کا فرق ایسی بیّن چیز ہے جس کے متعلق کچھ زیادہ لکھنا بے سود معلوم ہوتا ہے۔

غیروں کا تشبہ

مولانا صاحب نے اپنے رسالہ میں ایک اور چیز کا بھی ذکر کیا ہے جس کے لیے وہ اپنی عادت سے مجبور نظر آتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ عام طور پر اپنی تقریروں میں اس قسم کی چیزیں بیان فرماتے رہتے ہیں۔ لکھتے ہیں:-

"بڑے بڑے دعویدار اسلامیت و مذہبیت ایسے ہیں جن کی صورت اور لباس میں اور انگریزی صورت اور لباس میں فرق معلوم نہیں ہوتا۔" (ایضاً صفحہ ۶۱)

ہر چند یہ چیز ہماری اصولی بحث کے دائرہ سے خارج ہے اور یوں بھی ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ:-

درویش صفت باش و کلاہ تتری دار

لیکن چونکہ مولانا صاحب اس چیز پر خاص زور دیتے رہتے ہیں۔ اس لیے ہم ان سے اتنا دریافت کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ مغرب زدہ مسلمانوں کے اس "اتباعِ فرنگ" پر تو آپ آئے دن اعتراضات کرتے رہتے ہیں۔ لیکن آپ کی نگاہ اُن مسلمان "مہاشوں" کی طرف کیوں نہیں اُٹھتی جو نہ صرف لباس میں ہی بلکہ آدابِ معاشرت تک میں بھی خالص ہندی "رنگ" میں رنگتے جا رہے ہیں۔ ان کو بھی تو کبھی ٹوکا ہوتا کہ غیروں کا تشبہ اسلام میں جائز نہیں۔ ایک قوم پرست اسلامی درسگاہ کے ایک مسلمان پروفیسر نے ایک مرتبہ بڑے فخر سے کہا کہ وہ جب پنجاب کے دورے کے لیے نکلے ہیں تو ہر جگہ "پنڈت جی نمسکار" کہہ کر ان کا سواگت کیا جاتا تھا! ایسے حضرات کے اسلام میں مولانا صاحب کو کبھی کوئی نقص نظر نہیں آتا۔ لیکن اُن سے اختلافِ رائے رکھنے والوں کی ہر چیز سے کفر ٹپکتا دکھائی دیتا ہے! اسے اگر "رنگین چشمہ" کی برکات نہ کہیئے تو اور کیا کہیئے؟

میری نگاہِ شوق پہ اس درجہ سختیاں　　　اپنی نگاہِ شوخ کی کچھ بھی سزا نہیں

۱؎ ظاہر ہے کہ اشارہ علامہ اقبالؒ کی طرف ہے۔ (طلوعِ اسلام)

شَہَادَۃٌ مِّنْ اَھْلِہَا

گذشتہ صفحات میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کے پیشِ نظر آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ ایسی دو قومیں جن کا مذہب، تمدن، تہذیب، کلچر مختلف ہوں۔ جن کے نظریاتِ زندگی الگ الگ ہوں۔ نصب العین حیات جداگانہ ہوں۔ وہ قومیں قرآنِ کریم کی رو سے، باہم گھل مل کر، ایک متحدہ قومیت کے رشتہ میں منسلک نہیں ہو سکتیں نہیں ہو سکتیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ثابتہ ہے جس کا اعتراف اب غیر مسلموں تک کو کرنا پڑا ہے۔ مولانا حسین احمد صاحب تو کفر و اسلام کے امتزاج سے متحدہ قومیت کی تشکیل کا وعظ فرما رہے ہیں اور ان کے ایک پچھلے صدر کانگریس مسٹر بوس کا یہ ارشاد ہے کہ:

"کلچر، زبان، تہذیب، غرضیکہ ہر شے میں، برطانیہ اور ہندوستان ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس لیے سوائے خوشگوار تعلقات کے کوئی اور چیز ان ہر دو ممالک کو آپس میں نہیں ملا سکتی اور ہندوستان کی طرف سے اس قسم کے تعلقات اسی صورت میں پیدا ہو سکیں گے جب یہ ملک کامل آزادی حاصل کرلے گا۔" (اسٹیٹس مین۔ مورخہ ۱۱/۳ ۷ء)

دیکھئے! یہ ہے وہ جادو جو سر چڑھ کر بولتا ہے کانگریسی حضرات خود اس اصول کو تسلیم کرتے ہیں کہ ایسی مختلف قومیں جن میں تہذیب، تمدن وغیرہ کا اشتراک نہیں ہوتا۔ ایک متحدہ قومیت میں تحلیل نہیں ہو سکتیں۔ البتہ ان میں اچھے تعلقات پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ یعنی باہمی وفاق اور معاہدہ کی رو سے اور وہ بھی ایسی صورت میں کہ دونوں قومیں اپنے اپنے معاملات میں بالکل آزاد ہوں۔ لیکن یہی اصول جب مسلمان پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چونکہ ہندو اور مسلمان تہذیب، تمدن، مذہب وغیرہ میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس لیے یہ دونوں مل کر متحدہ قومیت میں تبدیل نہیں ہو سکتے۔ البتہ ان میں باہمی اتحاد پیدا کیا جا سکتا ہے اور اس کی یہی شکل ہے کہ مسلمان اور ہندو اپنے اپنے معاملات میں دو جداگانہ اور آزاد قومیں ہوں اور ان کے درمیان اشتراکِ عمل کا ذریعہ معاہدہ اور میثاق ہو۔ تو کانگریسی ہندو حضرات اُسے اصولِ حریت نوازی کے خلاف بتاتے ہیں اور قوم پرست مولوی صاحبان اسے "سحرِ برطانیہ" کا پیدا کردہ کفر قرار دیتے ہیں۔ یہ ہے قوم پرست حضرات کا اصولِ سیاست اور یہ ہے اُن کا تفقہ فی الدین۔ یعنی یہ ہمارے ائمہ دین مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک اجتماعی زندگی بسر کرنے کو خلافِ مذہب بتاتے ہیں اور غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ایک متحدہ قومیت کی تعمیر ان کے نزدیک عین قرآن و حدیث کے مطابق ہے۔ ان کی فقہ میں میدانِ عرفات میں جمع ہونے والے مسلمان سب فرقہ پرست ہیں کہ وہ اپنی الگ، خالصتہً اسلامی جماعت کے وجود کا پتہ دیتے ہیں۔ اور ہری پور میں اکٹھے ہونے والے مسلمان اسلام کے صحیح ترجمان ہیں کہ وہ متحدہ قومیت کے علمبردار ہیں۔ ان کے نزدیک ہندو اور مسلمان تو بھائی بھائی بن سکتے ہیں۔ لیکن مسلمان اور مسلمان آپس میں مواخات کا رشتہ پیدا نہیں کر سکتے۔ یا للعجب

برہمن گفت برخیز از درِ غیر　　نہ یارانِ وطن ناید بجز خیر
بیک مسجد دو مُلّا می نگنجد　　ز افسونِ بتاں گنجد بیک دیر　　(اقبال)

وطنیت کی جہنم

حضرت علامہ نے قرآن کریم کی روشنی میں بتایا تھا کہ وہ قومیت جس کی بنیاد وطنیت پر رکھی جاتی ہے نوعِ انسان کے لیے

کس قدر جنتی زندگی پیدا کرنے کی موجب ہوتی ہے اور وطنیت وہ جذبہ ہے جس کے بغیر (بقول مولانا صاحب) ہندوستان میں متحدہ قومیت کی تشکیل ہو ہی نہیں سکتی۔ فرماتے ہیں:۔

"ہندوستان کے مختلف عناصر اور متفرق ملل کے لیے کوئی رشتۂ اتحاد بجز متحدہ قومیت نہیں جس کی اساس محض وطنیت ہی ہو سکتی ہے اس کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں۔" (انصاری ۲/۳۸ ۷۱)

حیرت ہے کہ ایک طرف ہمارے علماء کرام ہیں کہ جن کے گھر میں سیاسی اور تمدنی زندگی کے تمام مسائل کے لیے درخشندہ اصول موجود ہیں۔ لیکن وہ ان اصولوں کے خلاف دوسروں کے نظریاتِ زندگی کو نصب العین حیات بنا رہے ہیں اور دوسری طرف غیر مسلم ہیں کہ وہ چاروں طرف سے ٹھوکریں کھا کر قرآن کریم کے انہی نظریات کو صحیح اصولِ زندگی قرار دے رہے ہیں۔ اسی "وطنیت" کے متعلق اگلے دنوں مسٹر کے بیٹراجن نے بمبئی یونیورسٹی کے کانووکیشن ایڈریس کے دوران میں کہا تھا:۔

"عصرِ حاضر کا ایک مہیب ترین خطرہ جس سے بچنے کے لیے یونیورسٹی کے ہر فرد کو کامل جدوجہد کرنی چاہیئے یہ ہے کہ قومیت کا وہ تنگ نظریہ جس نے یورپ کو آج یوں جہنم زار بنا رکھا ہے۔ نوجوانوں کے دلوں میں سرایت نہ کر جائے۔ یہ وہ نظریہ ہے جس کی رُو سے غلط اور صحیح، جائز اور ناجائز، جھوٹ اور سچ کے امتیازات "سودیشی" اور "بدیشی" کے امتیازات کے تابع ہو جاتے ہیں کبھی اس چیز کو ایّامِ جاہلیت کی یادگار سمجھا جاتا تھا کہ ہر وہ شئے جو اجنبی اور بدیشی ہو اس سے نفرت کی جائے۔ لیکن آج یہی چیز "قومیت" کا طرۂ امتیاز ہے جس میں ۲/۳ حصہ یہ اصول ہے کہ وہ لوگ جو تمہارے ملک سے باہر رہتے ہوں ان کی طرف سے بدگمانی اور نفرت کے جذبات دل میں موجزن رہیں۔ وہ قلب جو وطنیت کے ان جذبات سے متاثر ہو جاتا ہے۔ اخلاق کے تمام معیاروں کی طرف سے بےحس ہو جاتا ہے اس لیے کہ آج حریت نوازی نام ہی اس چیز کا رہ گیا ہے کہ انسان اس اصول پر آنکھیں بند کر کے کاربند رہے کہ "میرا ملک غلط یا صحیح" (سب پر مقدم ہے)۔" (اسٹیٹس مین ۱۱/۳۸ ۴)

یہ ہے وطنیت کا وہ ملعون جذبہ جس کی مخالفت اسلام نے اس شد و مد سے کی ہے اور جس کے متعلق حضرت علامہ نے آج سے آٹھ سال پیشتر اپنے مشہور خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا:۔

سیاسیات کی جڑ حقیقتاً انسان کی روحانی زندگی میں ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اسلام ذاتی آراء کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک سوسائٹی ہے۔ یا اگر آپ پسند فرمائیں تو اُسے ملکی اور مذہبی نظام کہہ سکتے ہیں میرے سیاسیات میں دلچسپی لینے کا اصل سبب یہ ہے کہ کہیں دورِ حاضرہ کے سیاسی اصول جو دہریت پر مبنی ہیں اسلام کے بنیادی اصولوں کو متاثر نہ کر دیں۔ میں یورپ کے پیش کردہ نیشنلزم (وطنیت) کا سخت مخالف ہوں۔ (اس نیشنلزم کی تعلیم ہے کہ قوم کی بنیاد مذہب پر نہیں بلکہ وطن پر ہے۔) کیونکہ مجھے اس میں دہریت اور الحاد کے جراثیم نظر آ رہے ہیں اور یہ جراثیم انسانیت کے لیے سخت مضر ہیں۔

لیکن چشمِ فلک نے یہ دن بھی دیکھنا تھا کہ اسی نظریۂ وطنیت کو ایک دن ہندوستان کے سب سے اعلیٰ دارالعلوم کے سب سے

۱؎ مسٹر مہر چند مہاجن (مدیر؟) نے بھی اپنی ایک تقریر میں قومیت کے متعلق قریب قریب یہی کچھ کہا ہے ملاحظہ ہو اسٹیٹس مین ۱۲/۳۸ ۲۱

بڑے کلید بردار کے حجلۂ دماغ سے کتاب وسنت کا حسین و دلکش نقاب اوڑھ کر مسلمانوں کے لیے فریبِ نگاہ بنتا تھا۔ آج اسلام کی مظلومیت کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے اور مسلمانوں کے لیے صفِ ماتم بچھانے کا اس سے زیادہ اندوہناک مقام اور کونسا ہو سکتا ہے۔ حیرت ہے کہ اس پر آسمان کیوں نہ ٹوٹ پڑا۔ زمین کیوں نہ شق ہو گئی۔

اے محمدؐ گر قیامت را برآری سر ز خاک　　سر برآور و ایں قیامت درمیانِ خلق بیں

اور پھر ستم بالائے ستم کہ یہ سب کچھ سہواً نہیں ہوتا بلکہ غلطی پر متنبہ کرنے والے مردِ حق شناس کو ساحرِ برطانیہ کے طلسم وافسوں کا شکار بتایا جاتا ہے اور دینِ حجازی کے اس محرمِ اسرار کو "افرنگ زدگی" کا طعنہ دے کر "برطانیہ کی عظیم الشان خدمات انجام دینے والا" قرار دیا جا رہا ہے اور یہ سب اس جرم کی بناء پر کہ وہ اس دورِ تجدد پسندی میں اس رسمِ کہن کی یاد کیوں تازہ کر رہا ہے جس کی رو سے مکہ کا ابوجہل گلے نہیں لگایا جا سکتا۔ لیکن فارس کا سلمانؓ "اہلِ بیت" میں سے ہو سکتا ہے۔ لیکن اس بیچارے کی مجبوری پر بھی تو نگاہ رکھیئے جسے قرآن کریم کا ہر حرف پکار پکار کر کہہ رہا ہو کہ یہ وہ نظریہ ہے کہ:-

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے

اور جسے حضورِ رسالتمآبؐ کے خاکِ قدم کا ہر ذرہ اُبھر اُبھر کر دکھا رہا ہو کہ یہ وہ اصولِ سیاست ہے کہ:-

قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

وہ کس طرح آپ کی ہمنوائی میں شریک ہو جاتے۔ اسی مجبوری کی بنا پر تو اس نے کہا تھا کہ ؎

غلامم جز رضائے تو نجویم　　جز آں راہے کہ فرمودی نپویم
ولیکن گر بہ ایں ناداں بگوئی　　خرے را اسپِ تازی گو، نگویم　　(اقبالؒ)

آخری گذارش

مولانا صاحب نے اپنے رسالہ کی "آخری گذارش" میں فرمایا ہے:-

"ہم اس عرض کے بعد اپنی تحریر کو اس فلسفیانہ تقریر اور شاعرانہ تخیل کے جوابات سے طویل اور دراز کرنا مناسب نہیں سمجھتے جو ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنے فلاسفری دماغ سے تراش کر کے ذکر فرمائی ہے"۔ (متحدہ قومیت اور اسلام ص۴۷)

اور اس رسالہ کے دیباچہ نگار صاحب نے اس کے مقصد کا ان گہربار الفاظ میں تعارف کرایا ہے۔

حضرت شیخ مدظلہ نے اس بحث کے ذیل میں جن مذہبی اور سیاسی جواہرات کے منتشر ذخائر کو مجتمع فرمایا ہے وہ نہ صرف متلاشیانِ حق کے لیے سرمایۂ طمانیتِ قلب ہی ہیں بلکہ ان سے یقیناً ہماری حیاتِ سیاسی کے ایک شاندار باب کی تعمیر ہوگی اور موجودہ و آئندہ نسلیں اسلامی نقطۂ نظر سے قومیتِ متحدہ کے مفہوم کو سمجھنے میں کسی سفسطہ کا شکار نہ ہو سکیں گی۔

کاش علامہ اقبال مرحوم آج ہم میں موجود ہوتے تو جو شبہات اس مسئلہ خاص کے بارے میں انہیں باقی رہ گئے تھے وہ بھی دُور ہو جاتے۔ (ایضاً صفحہ ۳)

اس مطلع اور مقطع کے متعلق ہم کچھ نہیں لکھنا چاہتے۔ کیونکہ ہم اس وقت صرف یہ کہنا چاہتے ہیں جب حضرت علامہؒ کے

استدلالات۔ مولانا صاحب کے اعتراضات اور ان کے جوابات قارئین کے سامنے آچکے ہیں۔ وہ از خود فیصلہ کرلیں گے کہ قرآن کریم کی رُو سے کونسا نظریہ ملتِ اسلامیہ کی زندگی کا ضامن ہے اور کونسا ان کی خودکشی کے مترادف۔ وہ کون سی حیات انگیز جرسِ کاروان ہے جو بلال رضؓ کے نغمۂ عشق کو اپنے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے اور وہ کونسی سکوت افزا بنسری کی لے ہے جو ناقوسِ برہمن کے شور میں گم ہو جانے میں ہی رازِ حیات پوشیدہ دیکھتی ہے۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ حضرت علامہ اگر آج ہم میں موجود ہوتے تو وہ مولانا صاحب کی اس تحقیق انیق کی داد کن الفاظ میں دیتے۔ البتہ جو کچھ ہم سمجھ سکے ہیں وہ تو اتنا ہی ہے کہ یا تو مولانا صاحب "متحدہ قومیت" اور "ہندو مسلم اتحاد" کے فرق کو ہی نہیں سمجھ سکے اور یا متحدہ قومیت کے متعلق اسلام کی تعلیم ان کی نگاہوں سے یکسر اوجھل ہے۔ اگر پہلی بات ہے تو ملتِ اسلامیہ کے لیے ماتم کا مقام ہے کہ یہ حضرات جو قوم کی کشتیٔ سیاست کے ناخدا ہونے کے مدعی ہیں، یہ سیاست حاضرہ کی اس ابجد سے بھی ناواقف ہیں۔ اور اگر دوسری بات ہے تو پھر معاف فرمایئے یہ کہنے میں کیا مبالغہ ہے کہ ایسا "فقیہہ ملت"۔

چہ بے خبر ز مقام محمدؐ عربی است

خلاصہ بحث

بحثِ قومیت کو اگر ہم چند مختصر الفاظ میں بیان کرنا چاہیں تو یوں کہا جائے گا کہ مولانا صاحب کے نزدیک ایک ملک کی جغرافیائی حدود کے اندر رہنے والے انسان عقائد و اعمال کے تمام اختلافات کے باوجود ایک قوم بن سکتے ہیں اور ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ یہ "قومیت غیر اسلامی ہے۔ اسلام کے نزدیک صرف وہی افراد مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں جن میں وحدت ایمان و عمل ہو۔ مولانا صاحب نے اپنے دعوے کے اثبات میں یہ دلیل بیان فرمائی ہے کہ قوم سے قوم ابراہیمؑ میں تمام مومن و کافر شامل تھے اور ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ یہ حضرات انبیاء کرامؑ جس قوم کی طرف مبعوث ہوتے تھے اس قوم میں ایسے افراد کو الگ کر کے جن میں وحدتِ عمل و ایمان ہوتی تھی ایک جداگانہ نئی قومیت کی تشکیل فرماتے تھے۔ یہ قومیت اسلامی قومیت کے معیار کے مطابق تعمیر ہوتی تھی۔ ہم نے اپنے دعوے کے اثبات میں کتاب و سنت کی نصوص صریحہ پیش کی ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں ہمیں چونکہ فریق مقابل سمجھا جائے گا۔ اس لیے اس باب میں کسی آخری فیصلہ تک پہنچنے کے لیے کسی حَکم کی ضرورت محسوس ہوگی۔ آیئے ہم آپ کے سامنے ایک ایسے حَکم کا فیصلہ پیش کر دیں جو مولانا صاحب کے نہ صرف ہم مسلک ہیں بلکہ جن کی علمی قیادت اور دینی امامت کے خود مولانا صاحب بھی معترف ہیں۔ سنیئے کہ ان کا فیصلہ کیا ہے۔ اور پھر غور فرمایئے کہ یہ حضرات آج کس کے جادو سے مسحور ہو رہے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد البلاغ بابت ۱۲/۱۱/۱۵ و ۲۶/۱۱/۱۵ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"انبیاء و مرسلین علیہم السلام میں سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوتِ موسسہ کے سامنے آتی جو پہلے صنف انبیاء میں بلحاظِ تقدم عہد کے ایک مخصوص امتیاز رکھتے ہیں۔ انھوں نے ایک جدید قوم پیدا کی اور اس کو مذہبی امتیازات و مقومات کی آب و ہوا میں پرورش کرنا چاہا۔ جن لوگوں نے مذہب کی اس حبل المتین کو مضبوط پکڑا عذاب الٰہی سے نجات پائی۔ مگر جن لوگوں نے اس سرشتۂ حیات کو چھوڑ دیا ہلاک ہو گئے اور باوجود رحمی و نسلی تعلقات کے خدا نے اُن کو نوحؑ

سے بیگانہ قرار دیا ان کی دعوت کی بنیاد نسل اور جغرافیہ نہ تھا وہ ایک نئی قوم پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے خود ان کی نسل جسمانی کے رشتہ کا بھی کوئی اثر باقی نہیں رہ گیا تھا۔ ان کا گھرانہ اب وہی قوم تھی جو حق و صداقت کے رشتہ میں منسلک ہو کر طیار ہوئی تھی اور سب سے پہلے وہ خود ہی اپنے پیدا کردہ خاندانِ ملت کے ایک رکن ہو گئے تھے۔ اگرچہ وَمَا اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلٌ۔

وَنَادٰی نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِیْنَ
قَالَ یٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (۱۱-۴۷)

اور حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے پروردگار کو پکارا کہ خدایا! تو نے وعدہ فرمایا تھا کہ تیرے خاندان کو عذاب طوفان سے نجات دی جائے گی تو احکم الحاکمین ہے تیرا وعدہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ میرے لڑکے کو اس عذاب سے نجات دے کیونکہ وہ میرے خاندان میں داخل ہے۔ خدا نے کہا۔ اے نوح! اُو جس کو اپنا اہل کہہ رہا ہے وہ تیرا اہل نہیں ہے۔ تیرا گھرانا تو در اصل عملِ صالح کا گھرانا ہے۔ (جس کی دعوت دے کر تو ایک صالح قوم پیدا کرنی چاہتا ہے) جو اس گھرانے میں داخل ہوا وہ تیرا ہے اور جو اس سے نکل گیا وہ تیرا نہیں رہا۔ بلکہ ان کے گھرانے کا فرزند ہو گیا جن کے عملِ بد کو اس نے اختیار کیا۔ پس مجھ سے وہ سوال نہ کر جس کا تجھے علم نہیں دیا گیا۔ اے نوح! یہ نصیحت میں اس لیے کرتا ہوں تاکہ حقائق و اسرارِ الٰہی تجھ پر کھلیں اور تو ان لوگوں میں سے نہ ہو جائے جو علم حقیقت سے محروم ہیں۔

تشریح مزید

اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح کو حکم دیا تھا کہ عذابِ طوفان سے بچنے کے لیے کشتی بناؤ۔ جب کشتی بن چکی تو فرمایا۔

احمل فیها من کل زوجین اثنین و اهلك (۱۱-۴۰)

کشتی میں تمام ضروری حیوانات و انواع کا ایک ایک جوڑا رکھ لو نیز اپنے گھرانے کے آدمیوں کو بھی سوار کرا لو۔

لیکن ساتھ ہی ان لوگوں کو اس سے مستثنیٰ بھی کر دیا تھا جن کے متعلق پہلے فرمان ہو چکا تھا کہ اپنے کفر و تمرد کی وجہ سے وہ اس عذاب میں ضرور حصہ پائیں گے اور ان کے لیے کوئی طلب اور کوئی سوال مقبول نہ ہوگا۔

اِلَّا من سبق علیه القول۔ مگر ان لوگوں کو ساتھ نہ لو جن کی نسبت پہلے حکم ہو چکا ہے۔

وہ پہلا حکم یہ تھا کہ لا تخاطبنی فی الذین ظلموا۔ جن لوگوں نے حق و عدالت سے انحراف کیا اور اپنی سرکشی و عدوان سے غضب ایزدی کے مورد ٹھیرے سو ان کی بابت مجھ سے کچھ نہ چاہنا۔

لیکن چونکہ حق تعالیٰ نے حضرت نوح کو ان کے "اہل" و اقارب کو بچا لینے کا حکم دیا تھا اور ان کا بیٹا بدرجۂ اولیٰ لفظ "اہل" کے جسمانی مفہوم میں داخل تھا اس لیے آپ کو جرأت ہوئی اور جنابِ خداوندی میں اسے اپنا "اہل" قرار دے کر سوال کیا۔ اس پر جواب ملا کہ اِنّه لیس من اهلك گو بظاہر وہ تمہارے اہل میں سے تھا لیکن در اصل اُسے تم سے کوئی تعلق نہیں۔ "اہل" میں وہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ وہ سرے سے تمہاری قوم ہی میں داخل نہ رہا۔ بلاشبہ وہ تمہاری قوم اور تمہارے گھرانے میں سے تھا لیکن

اب تو تمہاری قوم دوسری ہوگئی۔ تم نے حق اور راستی کی روح پیدا کرکے جو نئی قومیت عالم پیدا کی ہے اب سے وہی تمہارا قوم وہی تمہارا گھرانا وہی تمہارے اہل ہیں۔ تمہارا رشتہ صرف اس نئی قوم ہی کا رشتۂ اساس ہونا چاہیئے۔ وہ رشتہ خون اور جسم کا نہیں بلکہ حق اور دعوتِ حق کی روح کا ہے۔ اسی رشتہ میں منسلک کرکے یہ نئی قوم "دعوت نوحی" سے پیدا کی گئی ہے۔ تمہارے جسمانی تعلقات کے جو "اہل" اس قومیت میں داخل نہ ہوئے وہ تم سے کٹ گئے اور تمہاری جگہ "عمل غیر صالح" کی فرزندی میں داخل ہوگئے۔"

آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں:۔

"انسان کی اجتماعی حیات یا قومیت دراصل ان تمام عقائد و اعمال کے مجموعہ کا نام ہے جو نسل و وطن اور متوارث و متواصل علائق نسلی سے ترکیب پاتے ہیں۔ ان انبیاء کرامؑ کا مشن یہ ہوتا ہے کہ ان تمام نسلی اور قومی امتیازات فاسدہ کو مٹا کر ایک نئی روحانی امتیاز و خصوصیت کی بنیاد پر نئی قومیت پیدا کریں۔ پس اس بنا پر ان کی دعوت کا اوّلین اسوۂ حسنہ یہی ہونا چاہئے تھا کہ خود بھی نسل و خاندان کے تمام رشتوں کو توڑ دیں اور اس طرح نسلی قربانی کا طاقتور حربہ تیار کریں۔ اس قربانی کا اثر ان کے تمام کاروبارِ دعوت میں سب سے زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ قوم دیکھتی ہے کہ کس طرح داعی الی الحق نے اپنے تمام رشتوں کے گھر کو اجاڑ دیا اور اس عمارت کا ایک گوشہ بن گیا جس کی چھت کے نیچے ہمیں جگہ دے رہا ہے۔"

حضرت نوح علیہ السلام نے جس نئی اُمت کی بنیاد رکھنی چاہی تھی۔ اگرچہ ضلالتِ عصر اور جہل انسانیت اس سے دست و گریباں رہی اور اس لیے ما اٰمن معہ الا قلیل (۱۱-۴۰) اُن پر ایمان لانے کی سعادت نہیں ملی۔ مگر ایک چھوٹی جماعت کو۔

تاہم جس اُمتِ صالحہ کی اس عہدِ اوّلی میں بنیاد پڑی تھی وہ ضائع نہ گئی اور خدا کا کوئی حکمِ دعوت ضائع نہیں جا سکتا۔ اگرچہ خود حضرت نوحؑ پر بہت کم لوگ ایمان لائے۔ کیونکہ انسانی ملائیۃ و عمران کا بالکل عہدِ طفولیت بلکہ اس سے بھی مقدم تر دور تھا۔ اور مذہب کا سلسلہ ارتقا ابھی ابھی اپنی ابتدائی کڑیوں سے ایک دو قدم آگے بڑھا تھا۔ لیکن جب حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے صدیقین و متبعین کی اولاد زمین کے مختلف گوشوں میں پھیلی تو وہ اپنے ساتھ اس نئی قومیت کے عقائد و اعمال بھی لے گئی۔

"یہ دراصل اسی طرف اشارہ ہے کہ حضرت نوحؑ کی دعوت کسی خاص نسل اور قوم کو زندہ کر دینے کے لیے نہ تھی بلکہ وہ اس قسم کی دعوت میں داخل تھی۔ جو موجودہ نسلوں اور قوموں سے بالاتر ہو کر خود ایک نئی قوم پیدا کرتی ہے اور اس کی بنیاد محض اخوۃ دینی پر قائم ہوتی ہے۔ پس وہ جغرافیہ و نسل سے ماوریٰ رہ کر ایک عالم گیر برادری بن جاتی ہے اور زمین کا ہر ٹکڑا نوعِ انسانی کا ہر حصہ۔ اقوام و ملل کی ہر نسل اس کے دامن میں پناہ لے سکتی ہے۔" (اقتباسات البلاغ)

یہ تو ہے وہ نظریۂ قومیت جس کے ہم داعی ہیں۔ اس کے برعکس یورپ کا وہ نظریۂ قومیت ہے جس کی بنیاد جغرافیائی حدود پر رکھی جاتی ہے۔ اسے ساحرینِ مغرب نے کس طرح مسلمانوں کے اندر پھیلا دیا ہے اور وہ کیسا ابلیسانہ جال ہے۔ اس کے متعلق مولانا آزاد البلاغ بابت $\frac{15}{26}$ کے عربی افتتاحیہ میں فرماتے ہیں:۔

فالافرنجیۃ - الافرنجیۃ! الزموھا تکونوا من الفائزین - والقومیۃ! القومیۃ! اعلموھا ان کنتم مؤمنین .... فاولٰئک حزب الشیطٰن - الا ان حزب الشیطان ھم الخاسرون - (افرنگی متنوں کے خطیب تھندر چاتے ہیں کہ) فرنگیت - فرنگیت - اسے قبول کرو۔ اگر تم کامیابی چاہتے ہو اور قومیت، قومیت کا کوٹ ڈھنڈورا پیٹو اگر تم مومن ہو۔ خبردار! یہ سب شیطانی گروہ ہیں اور شیطانی گروہ ہی ناکام و نامراد ہونے والا ہے۔

اس کے بعد ہم مولانا حسین احمد صاحب کی خدمت میں سوائے اس کے اور کیا عرض کریں کہ:-

فبایّ حدیث بعدہٗ یؤمنون

محترم پرویز صاحب کا درس قرآن کریم

ملتان میں بروز جمعہ (بذریعہ ٹیپ) بعد نماز مغرب۔ بمقام دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ فون (۲۰۷۱)	**لائل پور میں** بروز جمعہ (بذریعہ ٹیپ) ۱/۲ ۵ بجے سہ پہر بمقام - دفتر بزم طلوع اسلام - ۷۵ کوتوالی روڈ متصل حیات سرجری کلینک رابطہ کے لیے فون (۲۳۹۴)	**لاہور میں** ہر اتوار - صبح ۸ بجے بمقام ۲۵/بی - گلبرگ ۲ فون نمبر (۸۰۸۰۰)

کراچی میں ہر اتوار صبح ۱/۲ ۹ بجے (بذریعہ ٹیپ) بمقام - دفتر بزم طلوع اسلام - دارالقائد ۲۰ - ۱/بی - بس سٹاپ ۲ - ناظم آباد ۳ فون (۶۱۰۴۶۸)	**سیالکوٹ میں** ہر اتوار صبح ۸ بجے (بذریعہ ٹیپ) چوہدری محمد دین ولد کمال دین نمائندہ بزم طلوع اسلام محمد دین ٹی سٹال - کرسچن ٹاؤن - بانہ پھکر

واہ میں بعد نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ) بمقام - ۱۵ - جہلم روڈ	**کوئٹہ میں** ہر اتوار ۳ بجے بعد دوپہر (بذریعہ ٹیپ) بمقام - ۲۰ - گورو نانک روڈ فون (۷۰۰۲)	**راولپنڈی میں** ہر جمعہ ۵ بجے سہ پہر (بذریعہ ٹیپ) بمقام - جی - ۱۶۶ - لیاقت روڈ

گجرات میں (بذریعہ ٹیپ) بروز جمعہ بعد نماز جمعہ - نیز بروز اتوار ۴ بجے بعد دوپہر بمقام - ۱۲ - ۱ - بی - سٹیمبر روڈ - بر مکان شیخ قدرت اللہ ایڈووکیٹ۔

محترم پرویز صاحب کی تازہ ترین تصنیف :-

"ختمِ نبوّت و تحریکِ احمدیت"

پر مندرجہ ذیل تبصرہ روزنامہ مشرق (کوئٹہ) کی اشاعت بابت ۱ مئی ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا ہے

مصنف : غلام احمد پرویز
ناشر : ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ - بی گلبرگ - لاہور
قیمت : پندرہ روپے

مسئلہ ختمِ نبوت کے بارے میں گزشتہ نوّے سال میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ بڑے بڑے جید علماء نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور اس کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔ لیکن زیرِ نظر کتاب چند خصوصیات کے اعتبار سے منفرد اور جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں اختصار مگر پوری جامعیت کے ساتھ، جذبات سے بالا تر رہ کر، خالص علمی اور منطقی انداز میں مسئلہ ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب احمدی اور غیر احمدی حضرات کے لیے جو حقیقت اور سچائی کے متلاشی ہوں، فکر انگیز اور بصیرت افروز مطالعہ ثابت ہو سکتی ہے۔ مصنف نے کوشش کی ہے کہ ہر بات دلیل کے ساتھ کی جائے اور دلیل کے لیے متعلقہ بحث کے اصل مصادر کا حوالہ دیا جائے۔

کتاب کا پہلا ایڈیشن اکتوبر ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا۔ اور دو ماہ میں ختم ہو گیا۔ جنوری ۱۹۷۵ء میں دوسرا ایڈیشن شائع کرنا پڑا۔ یہ چیز کتاب کی مقبولیت پر دلالت کرتی ہے۔

فرقہ اہلِ قرآن کی پھیلائی ہوئی
گمراہیوں کا تجزیہ

محترم پرویز صاحب کا یہ اہم اور مبسوط مقالہ جو جون ۷۵ء کے شمارۂ طلوعِ اسلام کے صفحات ۳۴ تا ۴۹ کی زینت بن چکا ہے، اسے اس کی افادیت کے پیش نظر علیحدہ پمفلٹ کی شکل میں بھی چھاپا گیا ہے جو صرف ایک روپے کے ٹکٹ بھیج کر حاصل کیا جا سکتا ہے۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵/بی - گلبرگ ۲ لاہور

لاہور میں قیام کے لیے
فون ---- ۵۲۲۵۹
پارک وے ہوٹل
PARK-WAY
صاف ستھرے ہوادار کمرے مناسب شرح پر
سنیئے
عمدہ - لذیذ اور پسندیدہ کھانوں کے لیے
معیاری طعامگاہ
آپ کی تشریف آوری کا شکریہ
منیجر پارک وے ہوٹل نزد ریلوے اسٹیشن لاہور

Islam : A Challenge to Religion

(By Parwez)

The very name of the book strikes one as a paradox, for it is universally recognised that Islam is one of the religions of the world. So how could a religion challenge the very institution to which it subscribes? The author has indeed made a successful bid to prove this strange aphorism for the first time in the history of Islamic thought and his research deserves careful study. It is thought-provoking; it is revolutionary, opening new vistas and bold horizons of intellectual endeavours. It is the outcome of life-long study of one of the renowned Quranic, thinkers of our times.

The author has not, however, taken a purely negative attitude. Having proved his claim that Islam is NOT a religion, he has very lucidly explained what Islam really is, and how it offers the most convincing and enduring answers to those eternal questions which every thinking man asks about the meaning and purpose of life, and how it can be achieved. The book is thus a unique attempt at the rediscovery of Islam.

Scholarly written and exquisitely presented.

Bound - Rs 35.00 Paper back - Rs. 20.00

(Postage extra)

Can be had from :

(1) IDARA-E-TOLU-E-ISLAM,
25-B, Gulberg II, LAHORE

(2) MAKTABA-E-DEEN-O-DANISH
Chowk Urdu Bazar, LAHORE